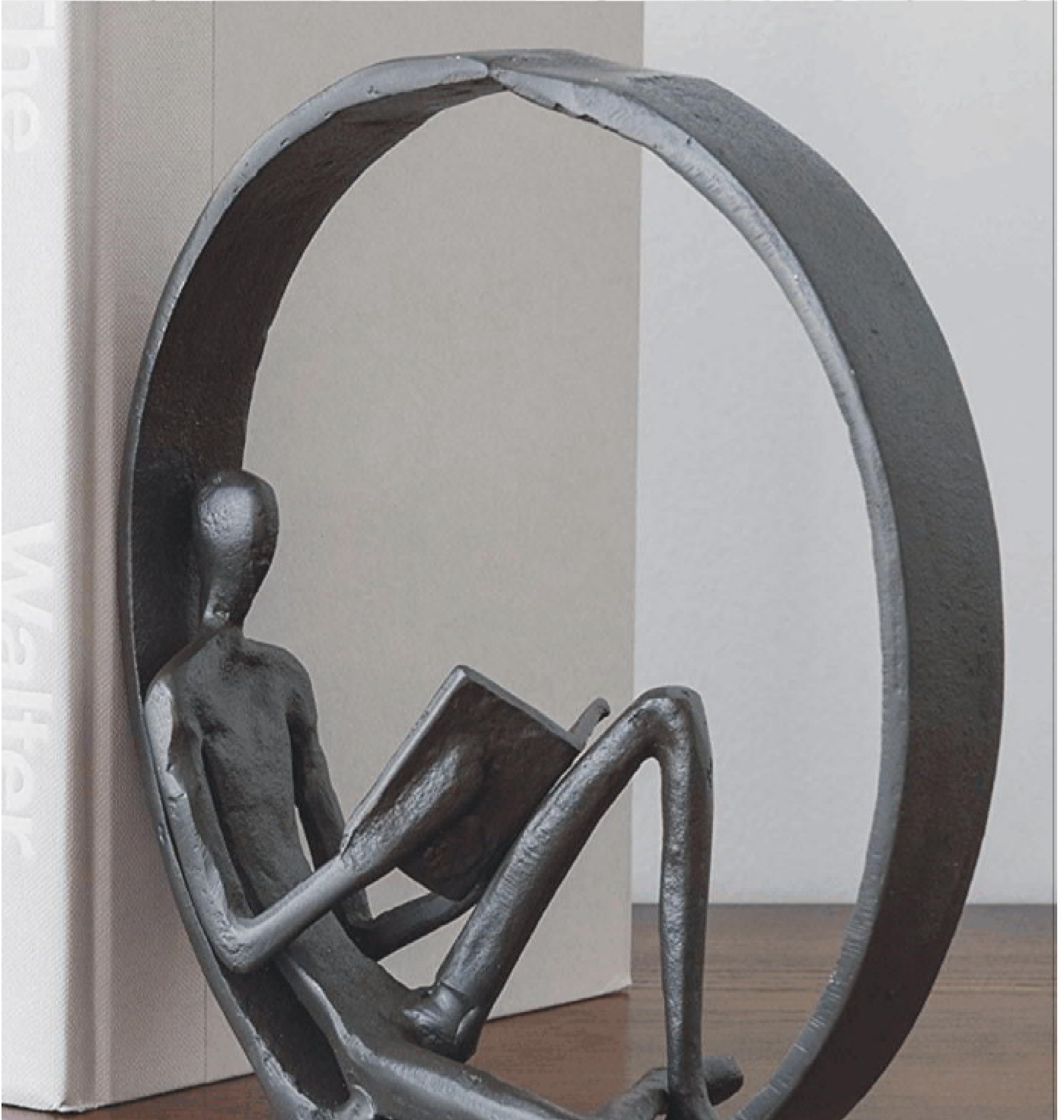
تحریک استشراق، لامتناہی تسلسل





افتخاراحمدافتخار

رہائش؛ ڈنگہ ضلع گجرات تحصیل کھاریاں

فون ؛ 03006281898

میل ایڈریس ؛ ift1167@gmail.com

نام کتاب؛ تحریک استشراق،لامتناعی تسلسل

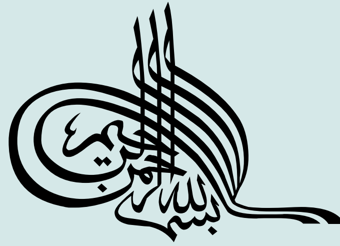
سنہ تحریر؛ مارچ 2019ء

کمپوزر و ڈیزائنر؛ افتخاراحمدافتخار

اہتمام؛ کتاب وسنت ڈاٹ کام

مطالعہ کے لیے؛ https://kitabosunnat.com

ڈاؤنلوڈ کے لیے؛ (محدث لائبریری)https://kitabosunnat.com



حرفِ آغاز

تحریك استشراق کی صدیوں کی جہد و سعی کا عکس آج اکیسویں صدی میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے جب عالمی ضمیر اور انسانی حقوق قصه پارینه بن چکے ہیں اور مسلمانوں کی حد تك عالمی ضمیر کی موت واقع ہو چکی ہے ۔صدیوں پہلے جب مسلمان نے اپنے ہاتھ سے قلم رکھ دیا اور اقتدار کی خاطر باہمی انتشار کا شکار ہوگئے اور سیاسی وعسکری حوالوں سے ان کا زوال شروع ہوا تو عیسائی اور یہودی مستشرق نے اس قلم کو اٹھا لیا اور ایك طویل جہد و سعی

سے لوگوں کی مہیب اکثریت کو اسلام سے بدگمان کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ زمانے کے بدلتے رنگوں میں تاریخ کے صفحات سیاہ ہوتے رہے مسلمان پستی اور زوال کی راہ کو چل دیا اُس کے ہزار سالہ اقتدار نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا جس کے ساتھ ہی علم کی راویت بھی اُن کے ہاں سے رخصت ہو گئی ۔ تب مسلم اسپین کی یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے کچھ عیسائی طالب علم اس جانب متوجہ ہوئے کہ وہ علم کی اس وادی کو مسخر کریں گے جس کی بنا پر مسلمانوں نے دنیا پر ہزار سال تك حکومت کی تھی ۔ ابتدا میں تحریك استشراق محض چند لوگوں کا ذاتی اشتغال تھا جس نے رفتہ رفتہ ایك عالمگیر تحریك کی حیثیت اختیار کر لی ۔

ان صفحات میں تحریك استشراق کی تاریخ کو بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس سے تو یہ پوری کتاب بھری پڑی ہے ۔ہم یہاں ان اثرات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو اس تحریك کے نتیجے میں آج کی جدید اور متمدن تہذیبوں پر اثر انداز ہوئے ہیں۔آج کی دنیا میں وہ سب کچھ ہے جس کی نوید سابقہ صدیوں میں سنائی دیتی تھی ۔ سائنسی و مادی علوم نے انسان کو زندگی کی سہولیات سے مزین کر دیا ہے اور اُس کی تمام زندگی کو ایك مادی محور کے گرد مقید کر دیا ہے ۔ جس

سے مادیت کے وہ مظاہر نمایاں ہوئے جس سے انسانیت کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا اور ایك آدم کی اولاد کو منتشر و متفرق کر دیا گیا آج کی اس مہذب دنیا میں تیسری دنیا کے وجود کو ایك حقیقت کے طور پہ بیان کیا جاتا ہے اور اس کے باوجود کہ تیسری دنیا نسل انسانی کے نام پر ایك بد نما دھبا ہے لوگوں کی ایك اقلیت نے انسانوں کی مہیب بستیوں کو تیسری دنیا کا نام دے کر اسے تمام بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیا۔

کوئی سوال کر سکتا ہے کہ تحریك استشراق کا تیسری دنیا کی پستی و زوال سے کیا واسطہ تو عرض یہ ہے کہ اگر G-8 ممالك کے لوگوں کے ذہنی احساس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ امر سامنے آئے گا یہ لوك دنیا میں بسنے والے لوگوں کی عظیم اکثریت کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ انھیں انسانی قبیلے میں ہی شامل کر لیا جائے بلکہ اُن کے نزدیك یہ وہ تجارتی منڈیاں ہیں جن میں ترقی یافتہ انسانوں کے لیے زرق کشید کیا جاتا ہے ۔ یہ وہ انسانی آبادیاں ہیں جن کے حقوق کی ضمانت اقوامِ متحدہ جیسے ادارے دیتے ہیں مگر صرف کاغذ کے ان صفحات پر جہاں اقوام عالم کے حقوق پر بحث کی گئی ہو۔ کاغذ کے ان جھوٹے خداؤں کے چہرے وقت کی راکھ میں دھندلا

گئے ہیں یا شاید مغرب کی دولت کی چمک سے ان کاغذوں کی سیاہی اڑ گئی ہے کہ امریکہ اور انگلینڈ میں کتوں کی خوراك بنانے والی کمپنیوں کا بجٹ تیسری دنیا کے بہت سے ممالك کے بجٹ سے زائد ہوتا ہے اب ظاہر ہے کہ ایك امریکی کتے اور سری لنکا ،نیپال اور افغانستان کے کتے کی سماجی زندگی میں بھی بہت فرق پایا جاتا ہو گا اور یہی وہ فرق نے جس تہذیبوں کے اس تصادم کو جنم دیا جو آج کی دنیا میں بپا ہے ۔ پچھلے زمانوں کا مستشرق آبادی سے دور ویران گرجوں کی پناہ گاہوں میں علم کی تلاش میں منہمك تھا مگر زمانے کے بدلتے اطوار نے مستشرق کے انداز فکر کو بھی بدل دیا اب وہ مسلمانوں کے عقائد میں نقائص تلاش کرنے کے بجائے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے استحصال کو اپنا ہتھیار بنائے ہوئے ہے ۔وہ مستشرق جس کو اپنے معاشرے میں بھی کوئی پذیرائی نہ تھی آج اس کی سوچ براہ راست حکومتوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔

آج کے مستشرق کو (THINK TANK) کہا جاتا ہے وہ اپنے گھرے استغراق سے نتائج اخذ کرتا ہے اور ان نتائج کو ایك ہتھیار کے طور پر اسلام کے خلاف استعمال کرتا ہے وہ آج وہ اس قدر طاقتور ہو چکا ہے کہ

ملکوں کی خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہو رہا ہے ۔وہ سچ یا جھوٹ جو بھی اپنی قوم کے مقتدر اداروں کے سامنے رکھتا ہے ادارے اسے تسلیم کر لیتے ہیں اور نتیجے کے طور پر مغرب کے سوچنے کا انداز تبدیل ہوتا رہتا ہے .اسلام دشمنی کے اس گھرے انداز فکر نے مغربی اقوام کو اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے ۔ مستشرق کی اس جہد و سعی نے انسانیت کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ وہ ایک ایسے سراب کے پیچھے بھاگتا رہا ہے جس کے آخر میں اس کے لیے فلاح کا کوئی پیغام نہیں ۔ مستشرقین کا ہدف خدائی قانون کو شکست دینا تھا جو امر محال ہے چنانچہ نتیجے کے طور پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مستشرق اپنی ہی آگ میں جل مرتا ہے کیونکہ پھونکوں سے سورج جیسے چراغ کو بجھایا نہیں جا سکتا.

افتخار احمد افتخار

فہرست عنوانات

مستشرق کی تعریف

جس طرح لفظ سیکولر کی کوئی واضح تعریف آج تک سامنے نہیں آسکی بلکہ مختلف الخیال لوگ اس کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔اسی طرح لفظ مستشرق کی بھی کئی تعریفیں سامنے آ چکی ہیں اور مختلف لوگ اس کو مختلف طریق سے ہی بیان کرتے ہیں۔تاہم استشراق کی جو تعریف عام طور پہ بیان کی جاتی ہے وہ ہے" غیر مشرقی لوگوں کا مشرقی زبانوں ،تہذیب،فلسفے ،ادب اور مذہب کے مطالعے میں مشغول ہونے کا نام استشراق ہے۔یعنی وہ غیر مشرقی عالم جو مشرقی علوم میں بے پناہ دلچسپی رکھتا ہو اور اس سلسلے میں اپنے اوقات اور توانائیاں خرچ کر رہا ہو اس کو مستشرق کہا جا سکتا ہے۔یا پھر اکسفورڈ ڈکشنری کی وہ جدید تعریف ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور اس کے مطابق (Orientalis) یعنی استشراق کا اطلاق ہر اس شخص پہ کیا جا سکتا ہے جو مشرقی علوم و آداب میں مہارت حاصل کرے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ استشراق کے حوالے سے بیان کی گئیں مندرجہ بالا تمام

تعریفیں ایسی نہیں ہیں جو صدیوں سے جاری تحریکِ استشراق کے ہر پہلو پر روشنی ڈال سکیں۔ایک قابل حیرت بات یہ بھی ہے کہ مستشرقین کی صدیوں کی مساعی کے جو علمی مصادر دستیاب ہیں ان میں بھی کہیں Orientalist یا Orientalism کی کوئی ایسی واضح تعریف موجود نہیں ہے جو تحریکِ استشراق یا مستشرق کی جامع تعریف کہلائے جانے کے قابل ہو۔ان کے ہاں اگر اس کا کوئی ذکر ملتا بھی ہے تو وہ انتہائی مبہم اور باہم مختلف ہے۔حتیٰ کہ یوحنا دمشقی (749ء) کو جس نے اسلام کے خلاف تحریر کے ابتدائی اسلوب وضع کیے اس کو محض اس لیے مستشرق ماننے سے انکار کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق دمشق سے تھا اور اس نے اپنے علمی مصادر فلسطین کے ایک گرجے میں بیٹھ کر تحریر کیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ تحریکِ استشراق صدیوں سے جاری تھی مگر اس کے اغراض و مقاصد کے حقیقی پہلو مخفی ہی تھے اس لیے مستشرقین اپنی اس تحریک کو زیرِ زمین ہی چلاتے رہے۔وہ اپنے مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھے۔اس لیے کئی صدیوں تک یہ تحریک کسی باضابطہ نام کے بغیر جاری رہی۔تاہم بہت سے مشاہیر اسلام نے تحریکِ استشراق کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اس تحریک کے مختلف نظریات اور مساعی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مستشرق اور استشراق کی کئی جامع تعریفیں بھی کی ہیں جن کا مختصر جائزہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ایک مغربی مورخ جس کا تعلق فرانس سے ہے کے مطابق استشراق یعنی (Orientalist) کا لفظ اول اول 1630ء میں ایک یونانی پادری کے لیے استعمال ہوا جو اسلام کے خلاف پرجوش خطابت کی وجہ سے مشہور تھا۔

پھر برطانیہ میں 1779ء اور فرانس میں 1838ء میں سنا گیا،مگر مشہور فرانسیسی مورخ (Rodenson) کے مطابق عملی طور پہ تحریکِ استشراق اس سے کئی صدیاں قبل ہی وجود میں آچکی تھی اگرچہ اس کے اجزا منتشر اور مساعی انفرادی حد تک محدود تھی اس لیے اس کے اثرات کو بھی فوری طور پہ محسوس نہ کیا جا سکا۔محقق اور تاریخ دان ڈاکٹر احمد غراب جن کا تعلق سعودی عرب سے ہے انھوں نے مستشرقین کا تفصیلی مطالعہ بیان کیا ہے اور لفظ مستشرق پہ بھی اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ان

کے مطابق تحریکِ استشراق کی بنیاد اہل مغرب کی نسلی برتری کے اس دعویٰ پر رکھی گئی ہے کہ اہل مغرب نسلی اور تہذیبی طور پر اہل مشرق سے ممتاز و برتر ہیں۔نسلی تقسیم کے اس فارمولے کو مغربی اسلوبِ فکر کی نفسیاتی پیچیدگی قرار دیا جائے یا اسے ان بیمار ذہنوں کا شاخسانہ کہا جائے جنھوں نے اپنی اقوام میں اس احساسِ برتری کو جنم دے کر دنیا کی ہولناک جنگوں کو جنم دیا۔یاد رہے کہ دوسری جنگ عظیم میں جرمن قوم کا ایک ہی نعرہ تھا کہ وہ دنیا کی سب سے برتر قوم ہے اس لیے اسے دوسری تمام اقوام پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔یہ بھی ذہن میں رہے کہ آج اگرچہ مغرب کئی حوالوں سے واقعتاً دوسری دنیا سے ممتاز مقام حاصل کر چکا ہے مگر متشرقین نے نسلی تقسیم کا یہ دعویٰ اس وقت کیا تھا جب دنیا کی تعمیر و ترقی میں اہل مغرب کا کوئی حصہ نہ تھا۔اس لیے جب یورپ اور امریکہ نے صنعتی، معاشی اور عسکری ترقی حاصل کر لی تو مستشرقین کا خواب حقیقت کا روپ دھار کے سامنے آ گیا۔

چنانچہ آج تقریباً ہر مغربی شہری اسی انداز میں سوچنے لگا ہے کہ وہ تہذیبی ،لسانی ،عسکری معاشی، سماجی اور اخلاقی طور پہ باقی ساری دنیا سے ممتاز و منفرد حیثیت کا حامل ہے اس لیے اسے دوسری تمام اقوام پہ حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔مگر ان کی راہ میں اگر کوئی حقیقی رکاوٹ کسی پہاڑ کی طرح کھڑی نظر آتی ہے تو وہ اسلام کا لازوال اور آفاقی نظام ہے جس کا توڑ کرنے کے لیے ہی تحریکِ استشراق کا آغاز ہوا اور آج تک یہ تحریک پورے جوش عزم اور بھرپور وسائل کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

چنانچہ ان استعماری ممالک کے علماء اپنی نسلی برتری کو ذہن میں رکھتے ہوئے مشرقی اقوام پہ غلبے کی پوشیدہ خواہش کے عملی اظہار کے طور پر اہل مشرق کی تاریخ ،تہذیب ،ادیان اور زبانوں کے علاوہ ان کے سیاسی اور اجتماعی نظامات پہ بھی بھرپور نظر رکھتے ہیں۔

وہ ان کے وسائل اور قوت مزاحمت کو مدنظر رکھتے ہوئے حالات کا تحقیقی مطالعہ پیش کرتے ہیں جو ان قوتوں کا پشت پناہ ثابت ہوتا ہے جو عملی طور پہ مشرق کی تہذیبوں کی فکری اور سیاسی اساس کو بدلنے کی سعی میں مصروف عمل ہوں۔چنانچہ استشراق دراصل اس اسلوبِ فکر کو کہا جائے گا جس کے تحت اہل مغرب اپنی تہذیبی اور اخلاقی روایات کو اہل مشرق پر منضبط کر سکیں اور اس کے لیے ضروری قرار

پائے گا کہ وہ مشرق میں پہلے سے قائم تہذیبی، اخلاقی اور سیاسی اقدار کو پست ثابت کرتے ہوئے اس کی تشکیل نو کا طویل سفر جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے اہل مغرب میں ہمیشہ سے ایک گروہ موجود رہا ہے جس نے اپنی تہذیبی برتری کا واویلہ جاری رکھا۔ انھوں نے ہمیشہ اس بات کا اہتمام کیا کہ اُن کے سینے میں چھپے ہوئے بغض کو محسوس نہ کیا جا سکے مگر خالق کی نگاہ سے مخلوق کی کوئی حرکت کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ہمارے ربِ قدیر نے ان کی اس ذہنیت کا پردہ پندرہ سو سال قبل ہی چاک کر دیا تھا۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَدَّت طَّآئِفَتہ مِن اَھلِ الکِتَابِ لَو یُضِلُّونَکُم وَمَا یُضِلُّونَ اِلَّآ اَنفُسِھُم وَمَا یَشعُرُونَ O

(القرآن الحکیم)

ترجمہ:

”دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہل کتاب سے کہ وہ کسی طرح تمھیں گمراہ کر دیں مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس حقیقت) کو نہیں سمجھتے“۔

****

مسلمانوں پر اہل مغرب کا دکھ قدیمی ہے کہ جب بنی اسماعیل کو ایک مدت کے بعد نبوت کے اعلیٰ منصب سے سرفراز کیا گیا تو دنیا بھر کے یہود و نصاریٰ ششدر رہ گئے کہ یہ کیا ہو گیا۔ کتنی ہی صدیاں بیت گئیں نبوت بنی اسحاق کے خاندان میں ہی چلی آ رہی تھی مگر اب کے نبیوں کے سردار ﷺ کا چناؤ بنی اسماعیل سے کر لیا گیا۔ جذبہ حسد سوچ کو مفلوج کر دیتا ہے مگر یہ بات تو بالکل سادہ تھی کہ معاملہ خالق اور اس کی مخلوق کے درمیان تھا اور اختیار تو سارے کا سارا خالق ہی کے پاس ہوتا ہے وہ جس کو چاہے منصبِ نبوت سے سرفراز کر دے کہ وہی بہتر جاننے والا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ اپنے

صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتایا کرتے کہ مدینہ کے یہودی انھیں ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں مگر ان کے اندر کا بغض انھیں مجھ پہ ایمان لانے سے روکتا ہے۔روایات میں آتا ہے جب نبی کریم ﷺ کی ولادت کا وقت قریب تھا تو مدینہ کے یہودی کفار کو یہ کہہ کر ڈرایا کرتے ایک نبی عنقریب ہی آیا چاہتا ہے اور وہ اس پہ ایمان لا کر کفار یعنی عربوں پر غالب آجائیں گے۔علاوہ ازیں ان کی کتابوں میں بھی نبی کریم ﷺ کی آمد کے متعلق پیشین گوئیاں پوری تفصیل سے موجود تھیں اور وہ آپ ﷺ کو بہت سی نشانیوں کے ذریعے بھی پہچانتے تھے۔دراصل تو تحریکِ استشراق کا آغاز یہودی قبائل کو مدینہ سے بے دخلی کا پروانہ ملنے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا مگر اسلام نے اتنی تیزی سے قوت حاصل کی کہ دوسری اقوام کو اپنے منتشر اجزاء اکٹھے کرتے کرتے چھ سات صدیاں بیت گئیں۔صلیبی جنگوں کی تفصیلات میں اس بات کا مشاہدہ بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ ان کے پیچھے مذہبی جنوں کو اجاگر کرنے کے لیے پادریوں اور یہودی ربیوں نے کس قدر محنت کی اور جنگوں کے اس طویل سلسلے کو جنم دیا جس کا نتیجہ ان کی شکست کی صورت میں نکلا اور مسلمان قبلہ اول پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔یہودیوں اور عیسائیوں کی تاریخ بہت خون آشام ہے یہ ایک دوسرے کے بد ترین دشمن تھے۔عیسائیوں اور یہودیوں نے ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہایا تھا۔مگر قبلہ اول پہ مسلمانوں کے قبضے کے بعد وہ کیا وجہ تھی کہ یہ دونوں اقوام ایک ہی صف میں کھڑی ہو گئیں اور مسلمانوں کے خلاف محاذ بنا لیا دراصل اس کے پیچھے بھی تحریک استشراق ہی کی انتھک کوشش تھی۔پیر محمد کرم شاہ صاحبؒ اپنی شاندار سیرت ''**ضیاالنبی**'' میں مستشرقین کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''اہل مغرب بالعموم اور یہود و نصاریٰ بالخصوص جو مشرقی اقوام خصوصاً ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں تہذیب و تمدن، تاریخ، ادب، انسانی قدروں، ملی وسائل، حیات اور امکانات کا مطالعہ معروضی تحقیق کے لبادے میں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان پر اپنا مذہب اور اپنی تہذیب مسلط کر سکیں اور ان پر سیاسی غلبہ

حاصل کر کے ان کے وسائل حیات کا استحصال کر سکیں ان کو مستشرقین کہتے ہیں اور جس تحریک سے یہ لوگ وابستہ ہیں وہ تحریک استشراق کہلائے گی"۔

****

اگرچہ مستشرق کی یہ ایک جامع تعریف ہے مگر دنیا کی تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ عصری تقاضوں کے مطابق تحریکِ استشراق کا جائزہ لیا جائے۔تحریک استشراق مدت ہوئی اب ان علماء کے ہاتھ سے نکل چکی ہے جن کا مقصد صرف تحریری اور فکری انتشار پھیلانا تھا جس کی وجہ سے یورپ میں اسلام کا عمومی تصور کچھ اس طرح کا تھا جس کا اسلام سے دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔دراصل اس دور کا مستشرق اسلام کی تیزی سے بڑھتی ہوئی قوت سے خائف تھا اور اپنی قوم کو اس سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا اور اپنے اس گھناؤنے فعل میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہا جس کا ثبوت یہ ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کا ایک فرانسیسی مورخ 'ہنری دی کاستر' اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ مستشرقین نے اسلام کے حقیقی تصور کو جس مسخ شدہ حالت میں اہل یورپ کے سامنے پیش کیا اسے دیکھ کے حیرت ہوتی ہے۔اول تو وہ اسلام کو کوئی علیحدہ دین ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھے اور اسے بھی عیسائیت ہی کی ایک منحرف شدہ شاخ قرار دیتے تھے۔بعد کے مستشرقین نے اگرچہ اپنے دامن پہ لگے ان داغوں کو دھونے کی بے پناہ کوشش کی ہے مگر وہ اس میں جزوی کامیابی ہی حاصل کر سکے ہیں اسی کوشش کا ایک عکس ذیل میں دی گئی سطروں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

"وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرونِ وسطیٰ میں رائج تھے ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے، یہ تمام داستانیں اور نظمیں مسلمانوں کے مذہب سے ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوئی ہیں۔جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں ان کا باعث وہی قدیم روایات ہیں جو ہر مسیحی شاعر کی زبان پہ تھیں، وہ مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست کہتا اور حسبِ ترتیب ان کے تین خدا

وضع کرتا ہے جن کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ خود بعد کے مستشرقین کے سر شرم سے جھک گئے ہیں یعنی ماہوم یا ماہون یا مافومیڈ اور اپلس تیسرا ٹراما گان، وہ نبی کریم ﷺ کا تصور نہایت بھونڈے انداز سے پیش کرتے۔انھوں نے کہا کہ محمد ﷺ نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پہ رکھی ان کے ہاں اسلوب اتنا پست ہے کہ ان کے الفاظ درج کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔انھوں نے بت شکن محمد ﷺ کے اوپر یہ بہتان باندھا کہ آپ ﷺ (معاذ اللہ) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش پر مجبور کیا کرتے تھے۔ اسپین میں جب مسلمان عیسائیوں پر غالب آئے اور ان کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا تو مسلمان لوٹ کر آئے اور انھوں نے اپنے بتوں کو توڑ ڈالا۔اسی عہد کا ایک اور شاعر کہتا ہے کہ مسلمانوں کا دیوتا ایک غار میں تھا اس پر وہ سب پل پڑے اور اس کے دونوں ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ایک ستون سے لٹکا دیا اس سے قبل کسی دیوتا کی اتنی تحقیر نہیں کی گئی جتنی مسلمانوں کے دیوتا کی کی گئی۔چنانچہ اس کے بعد مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور ازسرنو اپنے بتوں کو بنالیا اسی لیے جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ تمام شہر کا چکر لگائیں چنانچہ لوگ مسلمانوں کی مساجد میں گھس گئے اور لوہے اور ہتھوڑے سے "ماہومیڈ" کے تمام بتوں کو توڑ ڈالا"۔

****

ایک دوسرا مسیحی شاعر اپنے خدا سے دعا کرتا ہے کہ اللہ ماہوم کے بت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے،اس کے بعد وہ مسیحی امراء کو صلیبی جنگ کے لیے اس طرح ابھارتا ہے کہ اٹھو اور ماہومیڈ اور ٹراما گان کے بتوں کو اوندھا کردو اور ان کو آگ میں ڈال دو ان کو اپنے خداوند کی نظر کردو۔ایک مدت تک اہل یورپ کے ہاں اسلام کا تصور کچھ اسی قسم کا تھا۔دراصل اس دور کا مستشرق اس بات کا خواہش مند تھا کہ کسی طرح اسلام اور مسیحیت کا ادغام ہو جائے مگر کہاں اسلام کا وہ زندہ تصور جو قرآن وسنت کی روشنی سے مزین ہے اور کہاں عیسایت (پال) کا وہ تصورِ تثلیث جو پہلے قدم پہ ہی

شرک کا ارتکاب کرتا ہے اور خالق کے مقابل اپنے نبی کو لا کھڑا کرتا ہے۔ اسلام تو مسیحیت کی ضد ہے وہ اپنی مضبوط تہذیبی بنیادوں اور اعلیٰ تاریخی روایات کی وجہ سے ہمیشہ ہی مذاہب کی صف اول میں کھڑا رہا ہے۔ تاریخ عالم میں مسلمان اگر چہ بہت دفعہ مغلوب ہوئے ہونگے مگر اسلام ہمیشہ سر بلند ہی رہا ہے۔

چنانچہ وقت کے بدلتے دھاروں میں تاریخ استشراق کے بھی بہت سے پہلوؤں نے جنم لیا ہے کہ کل کا مستشرق کسی گرجے میں بیٹھ کر تصورِ اسلام کے چمکتے وجود پہ راکھ کی پرتیں چڑھانے میں مصروف رہتا تھا مگر آج جب مغرب معاشی صنعتی اور عسکری رفعتوں پہ فائز ہے تو اس کا اندازِ استشراق بھی بدل چکا ہے۔ آج ناروے، سویڈن، فرانس، جرمنی، امریکہ اور ہالینڈ سے آنحضرت محمد ﷺ کے بیہودہ کارٹون شائع کیے جاتے ہیں فلمیں بنائی جاتی ہیں تو اس کے پیچھے بھی اسی مستشرق ذہن کام کر رہا ہے جو اسلام کی روشنی کو بجھانے میں ناکامی پر جھنجلاہٹ کا شکار ہے اور اوچھی حرکتوں پر اتر آیا ہے۔ آج وہ اسلام کی کوئی بھونڈی شکل پیش کرنے سے قاصر ہے اس لیے براہ راست عملی اقدام پر اتر آیا ہے۔

آج کا مستشرق وہ امریکی تھنک ٹینک ہے جو دنیا پہ اہل مغرب کی تہذیبی بالادستی کا خواب اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح کئی صدیاں قبل کا گرجے والا مستشرق دیکھا کرتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ کل کا مستشرق بے بس تھا مگر آج کا مستشرق بے پناہ مادی وسائل سے لیس ہے اس لیے وہ اپنی اندر کی چبھن کو دور کرنے کے لیے دنیا کے چہرے کو لہو سے رنگ رہا ہے۔ انھوں نے (Nato) کے نام سے ایک امت کو ترتیب دیا ہے جس کا واحد مقصد دنیا سے اسلام کے خطرے کو دور کرنا ہے۔ چنانچہ وہ عراق میں ایک ملین سے زیادہ لوگوں کو شہید کر دیتا ہے اور افغانستان میں تین لاکھ سے زیادہ لوگوں کا لہو زمین پہ گرا دیتا ہے مگر ساتھ ہی اس بات پہ ششدر بھی ہے کہ نہ اسلام کی سر بلندی میں کوئی فرق آتا ہے نہ مسلمان کے جذبہ ایمانی کا درجہ حرارت کم ہوتا ہے اور وہ ہر جگہ بے سروسامانی کے عالم میں اپنی اور اپنے نظریے کی بقاء کی جنگ میں مصروف ہے۔ مستشرقین کے طریق کار اور مقاصد پر تفصیلی بحث تو اپنے مقام پر آئے مگر حقیقت یہ ہے روز اول کے مستشرق اور آج کے جدید مغربی دانشور کی

سوچ میں ایک ذرا سا فرق بھی محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اہل مغرب نے اپنی ہزار سالہ غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے باوجود ایک متمدن تہذیب ہونے کا دعویٰ کرنے میں جلدی سے کام لیا ہے۔ عملاً وہ خود کو اخلاقی طور پر برتر ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اہل مغرب نے جب کلیسا کے بے پناہ جبر کے رد عمل کے طور پہ اپنی زندگیوں کو الہامی تعلیمات اور مذہب سے الگ کیا تو چند جزوی اور پست فوائد کے علاوہ ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔ آج ان کا معاشرہ جن کھوکھلی بنیادوں پر استوار ہے اور جس طرح وہ اپنی اگلی نسل کو خاندان کی عدم موجودگی کی وجہ سے کنڈوم میں لپیٹ کر کوڑے دان میں پھینک رہا ہے اس کے نتائج کا بھیانک اندازہ مغربی دانشور کی نظر میں بھی ہے اور وہ پکار پکار کر لوگوں کو واپسی کی دعوت بھی دے رہا ہے مگر اب وقت اس کے موافق نہیں رہا کہ انھوں اپنی زندگی کی رفتار کو جو بے پناہ تیزی فراہم کی تھی آج اسی تیزی میں ساری قوم ہانپ رہی ہے وہ مذہب کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے مادیات کی آخری حدوں پہ جا کے دیکھ لیا ہے کہ وہاں سکون اطمینان اور روح کی شگفتگی جیسی کوئی نعمت نہیں ہے۔

چنانچہ آج کا مستشرق سفید قباؤں میں ملبوس مسیحائی کرنے کی بجائے ملٹی نیشنل کمپنیوں میں بیٹھ کر لوگوں کی رگوں سے لہو نچوڑ رہا ہے مگر زبان پہ دعویٰ وہی صدیوں پرانا ہے کہ وہ انسانیت کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اسی بھلائی کے عملاً نفاذ کے لیے امریکہ اور اس کے حواریوں کی فوجیں دنیا کے اسی سے زائد ممالک میں موجود ہیں جن میں سے بیشتر مسلمان ہیں کہ اہل مغرب کا دانشور جانتا ہے کہ کمیونزم کے خلاف سرد جنگ جیتنے کے بعد اب ان کی تہذیبی برتری کی راہ میں ایک ہی رکاوٹ ہے اور وہ ہے اسلام کی زندہ تہذیب، اس لیے کہ انھوں نے اپنی کتاب اور اپنے پیغمبر ﷺ کی سنت کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے اور وہ کسی طور بھی اپنی اقدار سے انحراف کی راہ پر چلنے کو تیار نہیں۔ دوسرا بڑا خطرہ آج کے مستشرق کو خود اپنی داخلی صورت حال سے ہے کہ آج جب ترقی یافتہ دنیا کا ہر شہری اس قابل ہے کہ ادیانِ عالم کا تقابلی مطالعہ کر سکے تو وہ بہت جلد اس مشق کے منطقی نتیجے تک جا پہنچتا ہے اور اسلام قبول کر لیتا ہے۔ چنانچہ سارے مغرب میں ہی اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور آج کے مستشرق کی روح کا وبال بنتا جا رہا ہے۔ ایک عام مغربی آدمی اپنی پیاسی

روح کی کسک سے مجبور ہو کر جب الہامیات کی طرف راغب ہوتا ہے تو اس کو اپنے تمام مسائل کا حل صرف اسلام میں نظر آتا ہے اس لیے وہ بغیر کسی جبر و اکراہ کے اسلام کے اس لازوال تصورِ زندگی کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

اسی تیزی سے پھیلتی ہوئی لہر کا مقابلہ کرنے کے لیے 9/11 کا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا کہ یہ نہ تو کوئی اتفاقی واقعہ تھا اور نہ ہی اس میں مسلمانوں کا کوئی عمل دخل تھا یہ تو آج کے مستشرق کی وہ چال تھی جو اس نے اپنے وسائل کی بنا پہ کھیلی۔ انھوں نے آئندہ کی دنیا کا جو تصوراتی نقشہ تیار کیا ہے اس میں ایک طرف تو مسلم دنیا ہے جو ذہنی طور پہ منتشر اور سیاسی طور پہ منقسم ہے جو سیاسی معاشی اور عسکری حوالوں سے اہل مغرب سے کوسوں پیچھے ہے مگر دوسری طرف اہل مغرب کا وہ مستشرق ہے جو آج گرجے کی بجائے پینٹا گون میں بیٹھتا ہے، سلامتی کونسل کے دفاتر کی رونق ہے اور نیٹو اقوام کی برتری کے لیے سیمناروں کو خطاب کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی اگر اسے آنے والے پچاس یا سو سالوں میں کسی تہذیبی جنگ کا سامنا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ وہ جانتا ہے اسلام ایک تہذیبی اصول ایک توانا تحریک ایک متبادل قوت کی حیثیت سے اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت مغرب کی تہذیبی اساس کو چیلنج کر سکے۔ پھر وہ یہ بات بھی جانتا ہے کہ دنیا کی توانائی کے پسنتھ فیصد ذخائر انھیں ممالک میں پائے جاتے ہیں جہاں مسلمان بستے ہیں اور ان کا اندازہ اور سوچ کے زاویے تقریباً درست ہیں اس لیے کہ اسلامی ممالک میں بھی بیداری کی ایک لہر موجود ہے۔ جو اہل مغرب کے عزائم سے نہ صرف بخوبی واقف ہے بلکہ اس کے اظہار کی بہت سی عملی صورتیں بھی ان کے پیش نظر ہیں۔

چنانچہ 9/11 کے بعد اہل مغرب نے ایک نیا ہوّا دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا اور ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت "دہشت گردی" کی اصطلاح کو لانچ کیا گیا اور اس کا بنیادی ہدف اسلامی دنیا کو قرار دیا گیا۔ چنانچہ دہشت گردی کے خلاف اس نام نہاد جنگ کی لپیٹ میں افغانستان، پاکستان اور عراق آئے جہاں دہشت گردی کے خلاف اس جنگ نے ان ممالک کو داخلی اور معاشی حوالے سے تباہ کر کے رکھ دیا اور اصل میں یہی وہ حقیقی اہداف ہیں جو آج کے مستشرق کے پیش نظر ہیں۔ اہل

مغرب جہاں اپنا مفاد جمہوریت میں دیکھتے ہیں وہاں وہ جمہوریت کا راگ الاپنا شروع کردیتے ہیں جب کسی اسلامی ملک میں جمہوریت اپنے قدم جمانے لگتی ہے اور مغرب کے مفادات سے ٹکرانا شروع کرتی ہے تو وہاں مغرب آمریت کی پشت پہ آ کھڑا ہوتا ہے۔ جہاں مذاکرات سے مخالف سر نگوں نہ ہو وہاں وہ طاقت کی زباں استعمال کرلیتا ہے کہ اسلامی دنیا میں موجود خلا اسے اس بات کی اجازت دیتا ہے۔

آج کا مستشرق بھی مسلمان کی تہذیب، عقیدہ، ثقافت، شریعت تاریخ اور نظام و وسائل میں اس خلا کی تلاش میں رہتا ہے کہ اسے جب بھی موقع ملے امت مسلمہ میں افتراق کو فروغ دے جو پہلے ہی عروج کی کافی منزلیں طے کر چکا ہے۔ آج کا مسلمان کمزور نہیں بلکہ پنجہ استشراق میں جکڑا ہوا ہے وہ اپنے عقائد اور تہذیب کے معاملے میں سمجھوتا کرنے پر تیار نہیں مگر اسے جبر کے اس نظام حکومت کے حوالے کر دیا گیا ہے جہاں وہ اپنی آرزوؤں کی قیمت ادا کرنے پر مجبور ہے۔ اسلامی دنیا کے بیشتر ممالک آج اندرونی انتشار اور انارکی کا شکار ہیں جس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان پہ وہ حکمران مسلط ہیں جن کا نام مسلمانوں سا اور عمل غیر مسلموں سے مماثل ہے۔ تحریکِ استشراق آج اس حوالے سے کامیاب نظر آتی ہے کہ بظاہر وہ بڑی خوبی سے اپنے اہداف کی طرف بڑھ رہی ہے اور دنیا کی زمام اقتدار بظاہر اہل مغرب کے ہاتھ ہے اور پوری دنیا میں نظامات عالم، نظریات عالم، معاشیاتِ عالم، سیاسیاتِ عالم، عسکریاتِ عالم، ترسیلاتِ عالم، ترجیحات عالم الغرض فکر و نظر کے ہر شعبہ میں اہل مغرب ہی کی اجارہ داری نظر آتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آخری پردہ اُٹھنے پر ان کے ہاتھ سوائے ناکامی اور نامرادی کے کچھ بھی نہیں آئے گا۔ یہ ہمارا ایمان ہے یہی ہمارا عقیدہ ہے اور یہی ہمارے نبی مکرم ﷺ کی تعلیمات ہیں کہ برائی کے مقابلے میں فتح ہمیشہ اچھائی ہی کی ہوتی ہے۔ آج کے مستشرق کے سامنے کرنے کے لیے بہت کام ہے وہ اسلامی ممالک میں سیاسی عدم استحکام پھیلاتا ہے ان میں انارکی پیدا کرتا ہے، ان کو ملٹی نیشنل کمپنیوں کے اس نادیدہ جال میں الجھاتا ہے جو اُن کی معاشیات کو لے ڈوبتی ہیں اور وہ عالمی مالیاتی اداروں کے مقروض ہو جاتے ہیں اور پھر یہ لوگ مقروض ممالک کی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں پہ اثر انداز ہوتے ہیں، اسلام پسند تحریکوں کو دبانا

خواندگی کی شرح کو ارادتاً پست رکھنا، آمریت کی پشت پناہی کرنا، بنیادی سہولتوں کی عدم فراہمی اور ان ممالک کے اداروں کو کمزور کرنا، مذہبی تفرقے کو ہوا دینا بھی شامل ہیں۔ مسلم ممالک کو اس خوف میں مبتلا کرنا کہ ان کی بڑھتی ہوئی آبادی ان کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے دراصل کسی مسلمان کے ہاں پیدا ہونے والا ہر بچہ ان کے لیے ایک مسلمان کا اضافہ ہے اس لیے مسلمانوں کی آبادی کو کنٹرول کرنے کا بخار اقوام متحدہ کو اکثر چڑھا رہتا ہے اور مغربی ممالک اس کے لیے بے پناہ مادی وسائل پانی کی طرح بہانے پہ بھی آمادہ رہتے ہیں اس طرح کے کتنے ہی مختلف ہتھکنڈے ہیں جو آج کے مستشرق کے پیشِ نظر ہیں۔

اول اول جب تحریک استشراق مجتمع ہوئی تو اس کے مقاصد ہمہ پہلو تھے اور پردہ خیر میں پوشیدہ تھے۔ انھوں نے تجارت، سیاست، ثقافت اور مسیحائی کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا تاہم ان کا ایک عزم روزِ اول سے مستحکم رہا کہ کسی طرح مسلمان کو اس کے آفاقی تصور سے دور کر دیا جائے۔ چنانچہ یہی آواز یہودیوں کے دل کی آواز تھی اس لیے انھوں ہر مرحلہ پر اس تحریک کی تقویت کے سامان کیے۔ اُن کی اسلام دشمنی کو خود ربِ قدوس نے اپنے پاک کلام میں بیان کیا ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ اٰمَنُوا الْيَهُودَ وَ الَّذِينَ اَشْرَكُوا O

(القرآن الحکیم)

ترجمہ:

”ضرور پائیں گے آپ سب لوگوں سے زیادہ مومنوں سے دشمنی رکھنے والے یہودیوں کو اور مشرکوں کو“۔

****

چنانچہ تاریخ عالم نے یہودیوں کو مسلمانوں کی مخالفت کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر دیا جو ان کے دشمن عیسائیوں نے وضع کیا تھا تو انھوں نے اسلام کے شجرہ طیبہ کی بیخ کنی کے لیے اپنے دشمنوں

سے بھی تعاون میں گریز نہ کیا۔رسول پاک نے اگرچہ اس سے قبل ہی مسلمانوں کو آگاہ کر تھا کہ:

" کہ سارا عالم کفر ایک ھی ملت ھے"۔

(الحدیث)

وہ ایک دوسرے سے چاہے کتنے ہی متنفر ہوں مسلمان کے مقابلے میں ہمیشہ اکھٹے ہی ہوں گے۔اسلام دشمنی کے علاوہ یہودیوں کی تحریکِ استشراق میں شمولیت کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ یہودی خود کو خدا کی سب سے پسندیدہ قوم قرار دیتے ہیں اور ان کے مذہب کے مطابق ان کے گناہ معاف ہو چکے ہیں اور اللہ نے تورات میں ان کو فلسطین سے لے کر وادی فرات تک کے سارے علاقے کا حکمران بنایا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ ساری دنیا انھی کے لیے تخلیق کی گئی ہے اور وہ خالق کی سب سے لاڈلی قوم ہیں اس لیے ان کا دعویٰ محض فلسطین تک محدود نہیں بلکہ ان کی نظریں خیبر اور مدینہ منورہ پر بھی ہیں جہاں سے ان کو ذلیل کر کے نکال دیا گیا تھا۔چنانچہ جب 1968ء میں بیت القدس پر اہل یہود قابض ہوئے تو انھوں نے برملا اپنے اس عزم کا اعادہٗ کیا کہ اب ان کے لیے بابل اور یثرب کی طرف جانے والے راستے کھل گئے ہیں۔چنانچہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی ممالک کی قیادت اپنے منصب کے حقیقی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے پورا کریں جو خالق نے ان کے لیے مقرر کیا ہے۔

وہ خود کو حکمران جاننے کی بجائے اگر اقتدار کو خالق کی امانت تصور کریں تو مستشرقین کے عزائم اپنی موت آپ ہی مر جائیں گے۔تصورِ امہ کو زندہ کرنے کی کوشش کی جائے اور اہل مغرب کی طرح اگر مسلمان بھی کسی ایک پلیٹ فارم پہ متحد ہو کر دفاع اور تجارت کی ایسی پالیسی وضع کریں جو اغیار کے تعاون کی محتاج نہ ہو تو امت بہت جلد وہ دن دیکھے گی جس میں اسلامی تہذیب کے اصل خدوخال واضح ہونگے اور جو مستشرقین کے لیے کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہ گا۔اگرچہ تیونس،مصر،لیبیا،یمن

شام اور ایران میں آنے والے اسلامی انقلاب نے مستشرقین کو مزید ذلیل کیا ہے۔



یہود و نصاریٰ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی تعلیمات کا جس خودسری سے انکار کیا اُس کا مطالعہ بھی اُن کی اخلاقی پستی پہ دلیل ہے۔وہ اپنے انبیاء کو اذیت دیتے بلکہ بعض اوقات قتل کردیتے، آئندہ صفحات میں ان کی سیاہ کاریوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں یہود و نصاریٰ کے احوال

اس بات سے انکار کرنا کافی دشوار ہے کہ آج تاریخ کا دھارا اہل مغرب کی تمنا کے تابع ہو چکا ہے اور وہاں دنیا جہان کے علوم پنپ رہے ہیں۔ ہزاروں درس گاہیں ہیں جن میں علم کے طالب اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ رصدگاہوں کا اِک ہجوم ہے جہاں سے چاند کے بعد اب مریخ اور دوسرے سیاروں پر کمندیں ڈالی جا رہی ہیں۔ انسان نے اپنے تمدنی سفر میں جتنے بھی پڑاؤ دیکھے ہیں وہ آج کی جدید ٹیکنالوجی سے کوسوں دور ہیں۔ آج انسان نے علوم سائنس کی افادیت کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ محض ایک صدی قبل بھی جس کا تصور تک کیا جانا ممکن نہ تھا۔ اہل مغرب نے اپنی معاشی اور عسکری قوت کو اتنا فروغ دیا ہے کہ دنیا کی زمام کار حقیقتاً انھیں کے ہاتھ میں ہے اور مسلمان عہد رفتہ کی شان و شوکت اور اپنی عظیم تاریخی روایات سے تہی ایک تحیر سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے

کے لیے تیار نہیں کہ امت کی اس شکست وریخت کے پیچھے کسی مذہبی تخیل کو دخل ہے اور اہل مغرب نے ترقی کی وہ سب منزلیں اس لیے طے کر لی ہیں کہ انھوں نے اپنے مذہب کو گرجے میں ایک پا دری سمیت قید کر رکھا ہے اور اپنی روزمرہ کی زندگی سے اسے بے دخل کر دیا ہے بلکہ وہ ان معروضی حقائق کی تلاش میں سرگرداں ہے جنھوں نے اسے دوسرے درجے کی قوم بنا کے رکھ دیا ہے۔ اسے اپنی تاریخ کی روشن راہ گزر چین لینے دیتی ہے نہ اہل مغرب کی وہ برتری اسے ہضم ہوتی ہے جو نگاہ کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ وہ اس دوراہے پہ کھڑا سوچ رہا ہے کہ وہ کتاب تو اس کے پاس ہے جو کامیابی کی کلید ہے، جو سحر کی نوید ہے، جو آزردہ روحوں کا سرور ہے جس پر اس کو کامل اعتماد ہے جو اس کے لیے متاع ناز ہے تو پھر اس زبوں حالی اور پستی کا جواز کہاں پنہاں ہے۔ زندگی کے مختلف اور رنگ بدلتے مناظر اسے اہل مغرب کی پہلو در پہلو برتری کا احساس تو دلاتے ہیں مگر اس کے من میں مچلتے ان سوالوں کے جواب دینے سے پہلوتہی کا رویہ اختیار کرتے ہیں جو اس کو کسی روگ کی طرح چمٹے جاتے ہیں۔ کبھی وہ اس دستِ نارسا کو دیکھتا ہے جو کل تک دنیا کی زمام کار تھامے ہوئے تھا تو اس کی دوسری نظر اپنے خالی دامن کی طرف اٹھتی ہے جہاں اسے نہ وہ اضطراب اور ندامت ملتی ہے جو اقتدار چھن جانے کا لازمی ردعمل ہوا کرتی ہے اور نہ ہی دین کی وہ کسک اس کے پیش نظر ہے جو اس کی ملی زندگی کا ثبوت مہیا کرے۔

تاریخ کے دروازے اس پہ چوپٹ کھلے ہیں اور ان دریچوں پہ ابھی وقت کی زیادہ راکھ نہیں جمی جن سے گزر کے اہل مغرب آج کی متمدن تہذیب میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ اندھیرے آج بھی کسی ضرب المثل کی طرح تاریخ کے بوسیدہ صفحات میں ایک گواہ کی طرح کھڑے پکار رہے ہیں کہ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ اہل یورپ نے جہالت ظلمت اور مذہبی جبر کے وہ مناظر دیکھے اور سہے ہیں کہ تاریخ عالم میں شاید ہی کسی اور قوم اور معاشرے نے ان کا سامنا کیا ہو۔ یورپی مورخین نے اپنی تہذیب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ان کا سب سے قدیم دور آٹھویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے اور پانچویں صدی عیسوی پر ختم ہوتا ہے۔ اسی دور میں روم کی عظیم سلطنت قائم ہوئی تب یونان سے علم وفنون کے دریا بہتے تھے اور بنی اسرائیل کے پیغمبروں کو سلطنت اور فرمانروائی حاصل تھی۔ مگر

پھر جب انھوں نے اپنے انبیاء کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا اوران کو ایذا دینے سے بھی گریز نہ کیا تو عہد رفتہ کی شان وشوکت نے ان سے منہ موڑ لیا۔تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ وہ ایک طوائف تک کی خواہش پہ اپنے انبیاء کو قتل کر دیا کرتے تھے۔چونکہ انھوں نے پستی کی یہ راہ اپنی مرضی سے اختیار کی تھی اس لیے اُن کو اِن راہوں کے منطقی نتائج کا بھی سامنا کرنا پڑا اورانھوں نے فراعین مصر کی غلامی میں انتہائی عزلت زدہ زندگی گزاری۔تاہم جب تک ان میں کسی حد تک خیر کا داعیہ باقی رہا خالق نے ان کو اپنی رحمت سے ڈھانپنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ان کا دوسرا دور 476ء سے شروع ہو کر یورپ کی نشاط ثانیہ پر منتج ہوتا ہے اورسولہویں صدی سے ان کے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے جو آج بھی جاری ہے اوراہل مغرب کی برتری بہت سے میدانوں میں قائم ہے۔اگرچہ اب ان کے ہاں خاندانی نظام کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایک ایسا خلا جنم لے چکا ہے جوان کو پھر پستی کی طرف لے جا رہا ہے۔بظاہر مضبوط بنیادوں پر استوار مغربی معاشرہ دراصل اندر سے کافی حد تک کھوکھلا ہو چکا ہے اوراس کا نوجوان سماج سے بغاوت کی راہ پہ مائل نظر آتا ہے۔وہ منشیات کے بے تحاشہ استعمال اور سٹریٹ کرائم میں ملوث ہونے کی وجہ سے اپنے سماج کا آزار بنتا جا رہا ہے۔تاہم اہل مغرب کے آج کے سماجی اوراخلاقی مسائل کا ہمارے موضوع سے ذرا کم ہی تعلق ہے اس لیے ہم اپنا رخ اہل یورپ کے اس دور کی طرف موڑتے ہیں جس کو قرون وسطیٰ کہا جاتا ہے۔

اسی دور میں عرب سے اسلام کا پیام کسی آندھی کی طرح اٹھا اوراس نے عیسائیوں سمیت دنیا کی ہر قوم کا نظام تلپٹ کر کے رکھ دیا کہ ہر دور میں یہی روایت رہی ہے کہ نظریات اسی قوم کے تسلیم کیے جاتے ہیں جو غالب اور طاقتور ہو۔چنانچہ اس عہد میں مسلمانوں اوراہل مغرب کا بہت سے محاذوں پہ ٹکراؤ ہوا جو مسلمانوں کی فتح اورعیسائیوں کی شکست پر منتج ہوا۔دراصل اہل رومہ کی متمدن ریاست کے قیام سے پہلے عیسائیوں نے تاریخ کا تاریک ترین دور دیکھا ہے۔ایک برطانوی مورخ (DR Dreaper) اپنی اس کتاب میں لکھتا ہے جو 1882ء کو رائل لندن سے شائع ہوئی کہ قرون وسطیٰ میں یورپ کا بیشتر حصہ لق ودق بیاباں یا پھر بے راہ جنگل تھا۔کہیں کہیں راہبوں کی خانقاہیں تھیں یا ان سے منسلک چھوٹی چھوٹی انسانی آبادیاں تھیں، جا بجا دلدلیں اور غلیظ جوھڑ تھے۔لندن

اور پیرس جیسے شہروں میں لکڑی کے ایسے مکانات تھے کہ جن کی چھتیں گھاس کی تھیں چمنیاں روشندان اور کھڑکیوں کا رواج ہی نہ تھا۔آسودہ حال امراء کا یہ حال تھا کہ وہ گھاس کے فرش پر سوتے اور بھینس کے سینگ میں شراب ڈال کر پیتے۔ان کے ہاں صفائی کا کوئی تصور نہ تھا بلکہ وہ اس سے طبعاً نفرت کرتے تھے۔ان کے ہاں گندے پانی کی نکاسی کا کوئی نظام موجود نہ تھا اس لیے ان کے گھروں کے سامنے ہی گندگی کے ڈھیر پڑے رہتے اور ان پر مکھیاں اور مچھر پرورش پاتے رہتے جو ان کے لیے بیماریوں کی سوغات لے کر آتے مگر ان کو اپنے اس آزار کا ادراک ہی نہ تھا۔لندن اور پیرس کی سڑکیں بارہ مہینے کیچڑ سے لت پت رہتیں اور روشنی کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے جو شخص بھی کسی ضرورت کے تحت اپنے گھر سے نکلتا وہ کیچڑ سے لت پت ہو جاتا۔معاشی حالات اتنے دِگر دوں تھے کہ پوری قوم پتھر کے دور کے انسانوں پر مشتمل نظر آتی۔تنگی رہائش کا یہ عالم تھا کہ گھر کے تمام افراد اور ان کے مویشی ایک ہی چھت کے نیچے زندگی گزارتے تھے۔عام لوگ کئی کئی سال تک لباس تبدیل کرنے کا تکلف نہ کرتے تھے اور نہ ہی اس کو دھوتے تھے جس کے نتیجے میں ان کے جسم کی بو دور دور تک جاتی تھی۔ان کے ہاں نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی پہ کفر کا فتویٰ لگایا تو الزامات کی فہرست میں یہ بھی درج تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کی طرح روز غسل کرتے ہیں۔

آگے چل کے (DR DReaper) ان کے مزید حالات بیان کرتے ہیں کہ اس دور میں اہل مغرب کے فقر و فاقہ کا یہ عالم تھا کہ عام لوگ سبزیاں پتے اور درختوں کی چھال ابال کر کھاتے تھے۔متوسط طبقہ کے ہاں ہفتہ میں ایک مرتبہ گوشت کھانے کو عیاشی سمجھا جاتا تھا۔1030ء کے قحط میں لندن کے بازاروں میں انسانی گوشت بھی بکتا رہا۔امراء کی تعداد بہت ہی کم ہوتی تھی۔عام انسان غربت کی اس غلاظت میں پس رہا تھا جو انسانی تاریخ کا پست ترین معیار تھا۔جو لوگ معاشرے میں کسی قدر آسودہ تھے ان کے شب و روز بدکاری شراب نوشی اور جوئے میں گزرتے تھے۔جاگیرداروں کے قلعے دراصل ڈاکوؤں کے اڈے تھے جو راہگیروں کو لوٹتے اور قتل کرتے تھے وہ قافلوں کے قافلے لوٹ لیتے اور مسافروں کو اغوا کر کے زرفدیہ وصول کرنے کے لیے حبس بے جا

میں رکھتے۔حصول زر کے لیے وہ مختلف طریقے استعمال کرتے مثلاً آدمی کے پاؤں کے انگوٹھوں کو رسی سے باندھ کر اسے لٹکا دیتے یا گرم سلاخوں سے اس کے جسم کو داغتے یا گرہ دار رسی کو گردن کے گرد لپیٹ کر پوری طاقت سے مروڑتے۔ یورپ میں سڑکیں نہ ہونے کے برابر تھیں اور ذرائع نقل وحمل کے طور پر بیل گاڑیاں خچر اور گدھے تھے۔جنگلوں اور پہاڑوں میں ایسے ڈاکو رہتے تھے جو آدم خوری بھی کرتے تھے۔ بیماریاں اور وبائیں عام تھیں۔صرف دسویں صدی میں دس تباہ کن قحط اور تیرہ وبائیں آئیں جن سے لوگ مکھیوں کی طرح ہلاک ہوئے۔

ان کی مذہبی حالت انتہائی عجیب تھی وہ کسی خاص سماجی ڈھانچے اور مذہبی عقائد کے تحت زندگی نہیں گزارتے تھے بلکہ ان کے ہاں مذہب کی تمام تر پونجی فریبی پادریوں کے تھیلے میں مقید تھی جو اتنے جعلساز تھے کہ انھوں نے تمام کا تمام دین اپنی مرضی اور مفادات کے حوالے سے وضع کیا ہوا تھا۔ پوپ جنت کی راہداریاں اور گناہ کے اجازت نامے فروخت کرتے تھے۔عوام کے لیے سود لینا حرام تھا مگر پوپ کا بینک لوگوں کو بھاری سود پہ قرضے دیا کرتا۔عوام کا ایک طبقہ مجسمہ ساز تھا تو دوسرا طبقہ قبر پرستی میں ملوث تھا۔ان کے علماء اور عشائے ربانی کرامات اولیاء رہبانیت اور تصرفاتِ روح کی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔یورپ کا مشہور مورخ(Gubben) لکھتا ہے کہ اتنے طویل زمانے تک بدی کی یہ کثرت اور نیکی کی یہ قلت تاریخ عالم میں کہیں نظر نہیں آئی جو عہدِ قرون وسطیٰ کا خاصہ رہی۔اس دور کے لوگ بنیادی انسانی اخلاقیات سے اس حد تک عاری تھے کہ ان کے احوال جان کر روح لرز اٹھتی ہے اور دل میں ان کے خلاف بغض جنم لیتا ہے اور کراہت کی لہر طبع کو مکدر کر کے رکھ دیتی ہے۔یہ لوگ اپنے مخالفین کی آنکھیں نکال دیتے ان کی زبانیں کاٹ دیتے۔ان کی کھال کھینچ دیتے یا پھر ان کو زندہ جلا دیتے۔

کہتے ہیں ایک دفعہ جب اہل رومہ نے روسیوں کو شکست دی تو انھوں نے قیدیوں کے ہاتھ کاٹ کر ان کے ہار بنائے اور ان سے قسطنطنیہ کی فصیل کو سجا دیا۔ایک اور موقع پر جب ان کے ہاتھوں اسلامی فوج کا ایک گروہ مغلوب ہوا تو رومیوں نے مسلم اسیرانِ جنگ کو سمندر کے کنارے لٹا کر ان کے پیٹ میں لوہے کے بڑے بڑے کیل ٹھونک دیئے تا کہ بچے کھچے مسلمان جب جہازوں پر واپس

آ ہیں تو اس منظر کو دیکھیں۔روم کے حکمران قیصر باسل دوم نے جب بلغاریہ پر فتح حاصل کی تو پندرہ ہزار اسیرانِ جنگ کی آنکھیں نکال دیں اور ہر سو قیدیوں کے بعد ایک قیدی کی ایک آنکھ رہنے دی تا کہ وہ باقی ننانوے اندھوں کو ان کے گھروں تک پہنچا سکے۔اس دور میں غلاموں کی تجارت اتنے زوروں پر تھی کہ غلاموں سے بھرے جہاز برطانیہ آتے اور وہاں سے یورپ منتقل کر دیئے جاتے اور یہ غلام عموماً پانچ شلنگ فی کس کے حساب سے فروخت ہوا کرتے۔سترھویں صدی کے یورپ کے متعلق معروف برطانوی مورخ (Brefalet) لکھتا ہے کہ لوگ ان دنوں اپنی ہر بدی کو نیکی سے بدل دیتے۔ان کے سفیروں کا کام بس یہی تھا کہ وہ وحشی سرداروں کی نفس پرستی اور برائی کو ایسے مغلوف انداز میں پیش کریں کہ وہ ان کی خوبی نظر آئے۔منافقت، جھوٹ، دھوکہ اور ریا کاری ایک لطیف فن بن کے رہ گیا تھا جس میں ہر شخص کو کافی مہارت حاصل تھی تاہم ''میکاولی'' کو اس فن کا امام سمجھا جاتا تھا۔

اہل یورپ کے عمومی رویے کے بارے میں جاننے کے بعد اس بات کا کوئی امکان نہیں رہتا کہ اس طرح کی کوئی قوم علم دوستی کی طرف بھی راغب ہو سکتی ہے چنانچہ اندازے کے عین مطابق ان کا جہل اور علم دشمنی بھی کسی تاریک رات کی مثل تھی جس کی صبح کو کئی حوالوں سے آج تک مغربی اقوام کھوج رہی ہیں۔اہل رومہ کی عظیم سلطنت کے زوال 476ء کے بعد ان پر پاپائیت حکمران ہو گئی جو 1546ء تک بلا شرکت غیرے سیاہ و سفید کی مالک رہی۔پوپ کی طاقت جونہی مجتمع ہوئی تو اس نے مذہبی ادب کے علاوہ تمام اصناف ادب پر پابندی عائد کر دی۔پوپ اور اس کے حواری پرلے درجے کے متعصب جاہل اور بے راہ رو تھے جس کا منطقی نتیجہ فکری جمود کی شکل میں سامنے آیا اور پورا یورپ اس فکری ظلمت میں گھر گیا جس کی پرچھائیوں نے آج تک اہل مغرب کا پیچھا کیا ہے۔پوپ نے لاکھوں کی تعداد میں کتابیں نظر آتش کرائیں اور علماء کو قتل کیے جانے کی بنا ڈالی۔اس نے طاقت کے زور پہ تمام علمی اداروں کو بند کرا دیا اور ان کی عمارتوں میں گھوڑے اور گدھے باندھے جانے لگے۔پوپ کی عملداری میں جہاں کوئی فلسفی مفکر یا عالم سر اٹھاتا اس کو قتل کر دیا جاتا اور اس گھناؤنے قدم پر عوام قطعاً کوئی اعتراض نہ کرتے بلکہ اس پہ خوشیاں مناتے جو ان کی جہالت اور بے حسی کا منہ

بولتا ثبوت تھا۔ پوپ سلویسٹر دوم نے جب یورپ میں چند درسگاہیں کھولنا چاہیں تو عام لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور مشہور کر دیا کہ پوپ سلویسٹر پہ شیطان مسلط ہو گیا ہے۔اسی طرح فریڈرک ثانی نے اٹلی کے مختلف شہروں میں مدارس قائم کیے تو پوپ نے اسے دجال قرار دے دیا اور ریاست سے نکل جانے کا حکم جاری کر دیا۔مشہور مورخ (BrafalT) لکھتا ہے کہ اُن دِنوں پوپ کے حواری اور راہب یونانی اور رومی فلاسفہ کی کتابیں جلا کر ان کی جگہ مسیحی اولیاء کی مبالغہ آمیز داستانیں لکھ دیتے۔چونکہ اس زمانے میں کاغذ ناپید تھا اور لکھائی کا کام عام طور پہ چرمی جھلی پہ کیا جاتا تھا جس سے سابقہ نقوش مٹا کر نئی تحریر درج کی جا سکتی تھی ۔ پاپائے اعظم (Greagoree) کی علم دشمنی تو ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی ہے گریگوری کا عہد (604-540) سائنس، تاریخ، ادب شعر اور دیگر علوم سے بے پناہ دشمنی کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔وہ دینیات یا مذہبی دعاؤں کے علاوہ ہر صنفِ ادب کا سخت دشمن تھا۔اس نے رومی علماء اور علم سیاسیات کے مشہور مورخ (Sosereo) کی سب تصنیفات کو آگ میں ڈلوا دیا اور مورخ (Lavei) کو اس کی تصنیفات سمیت آگ میں زندہ جلا دیا۔

انگلستان کا مورخ (Hachson Sterling) بیان کرتا ہے کہ پوپ کے حواری اور راہب گروہ در گروہ جا بجا گھومتے نظر آتے اور ان کو جہاں کہیں کوئی ادب پارہ کتاب یا آرٹ کا نمونہ نظر آتا تو وہ اسے بے دریغ آگ لگا دیتے۔چوتھی صلیبی جنگ میں جب صلیبیوں کا مقدس لشکر قسطنطنیہ پہنچا تو انھوں نے مقامی عیسائیوں کا تمام علمی اثاثہ آگ کی نظر کر دیا۔طرابلس میں اس دور کی عظیم ترین لائبریری قائم تھی جس میں کتابوں کی تعداد تیس لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے جو مسلمانوں کی علم دوستی کا ثبوت پیش کرتی ہے صلیبی لشکر نے جب اس شہر کو فتح کیا تو انھوں نے اس لائبریری کو نہایت بہیمت کے ساتھ نظر آتش کر دیا۔لائبریری کئی دن تک جلتی رہی اور اس کے شعلے دور سے دکھائی دیتے تھے۔انھوں نے اپنی جہالت سے نہ صرف دنیا کا تہذیبی اثاثہ جلا دیا بلکہ مسلمانوں کی کئی صدیوں کی محنت کو بھی تباہ کر دیا۔اسپین کی ایک مذہبی عدالت نے محض ایک حکم کے ذریعے عربی علوم پہ یہودی علماء کی لکھی ہوئی چھ ہزار کتابیں جلا دیں۔ایک برطانوی فلسفی جس نے اول اول مذہب اور

فلسفہ کے انضمام کی بنیاد رکھی وہ مشہور مسلمان فلسفی ابن رشد کا شاگرد تھا پادریوں نے اس کی بیشتر تصنیفات کو جلا دیا اور اسے یعنی(Joun erejna)کو بھی سخت اذیت سے دوچار کر دیا۔مسلمانوں نے اسپین میں ہر جگہ عظیم کتب خانے قائم کیے تھے مگر جب عیسائیوں نے سات صدیوں بعد ان علاقوں پہ دوبارہ قبضہ کیا تو اپنی علم دشمنی اور جہالت کی وجہ سے انھوں نے مسلمانوں کے تمام علمی وادبی اثاثوں کو نظر آتش کر دیا۔صرف طلیطلہ کے بشپ(Xminese)نے اسی ہزار سے زائد کتابیں نظر آتش کیں جوان کی بہیمت اور جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اگرچہ آج اہل مغرب نے بہت سے میدانوں میں دوسری دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا ہے مگر آج بھی وہ متمدن کہلانے کے قطعی لائق نہیں اس لیے کہ شراب ان کا مشروب عام سود ان کا طرز معیشت ہے اور زنا ان کا طرزِ زیست ہے۔اور اتنے بڑے خبائث کی موجودگی میں کسی معاشرے کو کبھی بھی متمدن قرار نہیں جا سکتا ۔ایسے معاشرے کے افراد اپنی بیمار ذہنی سوچ کو جب پوری دنیا پر مسلط کرنے کا اعادہ کرتے ہیں تو پھر زمین کا چہرہ یقیناً لہو رنگ اختیار کرتا ہے۔

اپنے اردگرد کی دنیا پہ ایک نظر دوڑائیں تو اس کے عملی مظاہر تلاش کرنے میں کسی کو ذرا برابر دقت پیش نہ آئے گی۔انھوں نے علم وادب وسائنس کے میدان میں ترقی کی راہوں پہ چلنے والے ہر مسافر کی راہ کو کانٹوں سے بھر دیا۔انھوں نے کولمبس جیسے عالمی سیاح کو فقیروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور دیا۔انھوں نے دوربین ایجاد کرنے والے گلیلیو کو جیل کی اس تاریک کوٹھری کی نظر کر دیا جہاں تازہ ہوا اور سورج کی روشنی کا گزر نہ تھا۔اس مشہور اطالوی ہیت دان کا قصور محض اتنا تھا کہ اس نے نظام شمسی کے متعلق کوپرنیکس کے نظریات کو تائید کی تھی۔1632ء میں اس کی مشہور زمانی تصنیف ''نظام عالم'' شائع ہوئی مگر اس کے بعد اس کی ساری عمر کلیسا کے جبر کے سائے میں بسر ہوئی بالآخر وہ ظلم وستم سہنے کے قابل نہ رہا اور جیل میں دس سال کی اذیت ناک قید کے شب وروز گزارنے کے بعد 1642ء میں زندگی کی قید سے آزاد ہوا۔اس کے علاوہ اٹلی کے مشہور فلسفی برونو کو ایک مذہبی عدالت کے حکم پر زندہ جلا دیا گیا۔الغرض اہل مغرب کی جہالت اور علم دشمنی کی داستان اتنی طویل ہے کہ اس پہ بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔اہل مغرب کا حال ان کے ماضی کی ذہنی پستی کا وہ عکس پیش کر

رہاہے جوکسی سے بھی چھپاہوانہیں ۔



مستشرقین کے ارادے ،مقاصد ،تحریک استشراق کے آغاز کا احوال ،تحریک استشراق میں مغربی علماء اور حکمرانوں کی دلچسپی کے احوال،تحریک استشراق کے وسطی دور کا مطالعہ اور بہت سے دیگر پہلوؤں سے اس علمی تحریک کا ایک مطالعہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

تحریک استشراق،ایک مطالعہ

اس تحریک کے آغاز کے بارے میں کسی متفقہ رائے کی عدم موجودگی میں ٹھوس دلائل کے ساتھ یہ بات کہنا کہ یہ تحریک فلاں سنہ کو فلاں جگہ سے شروع ہوئی مشکل ہے۔لوگ اس کے بارے میں متضاد اور متفرق رائے رکھتے ہیں۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس تحریک کا آغاز بارہویں صدی عیسوی میں ہوا جب دیر کلونی کے متعصب رئیس پطرس محترم کے ایما پر قرآنِ حکیم کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔پطرس محترم مسلمانوں کا سخت دشمن تھا اور اسلام کے خلاف بغض سے بھرا ہوا تھا۔وہ عیسائیوں میں اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے اور مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ سلوک کرنے کی طرف لوگوں کو بلایا کرتا۔پطرس نے اپنے وقت کے بہت سے اہل علم کو اکٹھا کر کے ایک جماعت تشکیل دی جس کا کام اسلامی علوم میں مہارت حاصل کر کے اس کا توڑ کرنا تھا۔چنانچہ اس جماعت نے بہت سی عربی تصنیفات کے تراجم کیے۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ تحریک استشراق کا آغاز 1312ء میں ہوا جب فینا

میں کلیسا کی کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان کی تدریس کے لیے خصوصی اہتمام کیا جائے۔ایک رائے یہ بھی ہے کہ سسلی کے سربراہ فریڈرک ثانی کے حکم پر تیرہویں صدی عیسوی میں مائیکل سکاٹ نامی ایک شخص نے ایک بہت بڑا ادارہ تشکیل دیا جہاں علوم اسلامیہ کو مغربی زبانوں میں منتقل کرنے کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا گیا۔پھر ان تراجم کو یورپ کی مختلف جامعات مدارس اور دیگر علمی اداروں میں تقسیم کر دیا گیا تا کہ اس سے استفادہ کیا جا سکے۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ دسویں صدی عیسوی میں جب پاپائے روم سلسفر ثانی کو پاپ کا منصب حاصل ہوا تو اس نے تحریکِ استشراق کی بنا رکھی اس لیے کہ وہ اشبیلیہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں میں علم حاصل کر چکا تھا اور عربی زبان وادب اور ثقافت کے متعلق وسیع علم رکھتا تھا۔

عربی قواعد کی رو سے استشراق،ثلاثی مزید کا بابِ استفعال ہے جس کا مادہ ش۔ر۔ق شرق ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس باب کے جملہ خصائص ولوازم یعنی اتخاذ وطلب وجدان وحسان اور تحول و تکلف وغیرہ کی جلوہ نمائی ،صاحبان استشراق کے احوال وشخصیات سے ،اوراُن کی تحقیقات و تخلیقات میں بہت نمایاں نظر آتی ہے۔گویا الفاظ کا پیکر بجائے خود اس بات کا مظہر ہے کہ مستشرقین کا علم تمام تر اکتسابی ہے جسے انھوں نے بڑی محنت وریاضت سے اور طلب وجستجو سے حاصل کیا۔اُس کی خاطر سفر وحضر،تمکن وتوطن اختیار کیا پھر اپنی تحقیقات کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ اُن میں تخمین وظن اور تخیل سے زیادہ کام لیا گیا۔زبان وبیان اور اصول لغت کی اس بحث سے قطع نظر یہ حقیقت ظاہر ہے کہ تحریک استشراق السنہ المشرقیہ کی واقفیت اور اسلامی علوم وآداب سے کے مطالعے سے آگے بڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام سے بغض وعناد تک جا پہنچی اور یہی اِس تحریک کی حقیقی منزل تھی۔ابتداء میں اس تحریک کے پیروکار نے اِن متعین مقاصد کے حصول کے لیے مختلف چولے اوڑھے،چنانچہ پہلے پہل تو یہ تحریک مشنری جذباتیت کا آئینہ دار رہی۔مگر دوسرے مرحلے میں تحریک استشراق نے ایک مستقل رویہ اور سلوک (Discipline) کی شکل اختیار کر لی اور اسی رویہ اور سلوک کو دائرہ عمل جان کر تمام ضروری مباحث کو موضوع سخن بنایا گیا۔یعنی اسلام اور اس کی تعلیمات

کو مجبوراً یا تکلفاً غلط طور پر پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ زمانے کے عہد بہ عہد ارتقاء کے ساتھ اسلامی تعلیمات ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں۔ انھوں نے اپنا دائرہ کار بڑھا لیا تھا اور قدیم تہذیبوں، قدیم زبانوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے مصر، عراق، شمالی افریقہ اور دوسرے علاقوں میں استشراقی سرگرمیوں کو منظم کیا گیا تا کہ یہ تہذیبیں اسلامی تہذیب وتمدن کے مقابل زندہ ہو سکیں۔ یہ عمل ایسے ہی تھا جیسے قبر سے کسی مردے کو نکال کر عمدہ سوٹ پہنایا جائے اور اسے زندوں کی مجلس میں اس طرح پیش کیا جائے گویا وہ بھی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ مگر جلد ہی انھیں اپنی اس جہد وسعی کی لغویت کا احساس ہو گیا اور انھوں نے اپنا رخ موڑ لیا اب اُن کا ہدف وہ زبان تھی جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ انھوں نے کہا قرآن کی زبان عہد جدید کی ضروریات وحالات سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتی اس لیے مقامی زبانوں اور مردہ لغات کو آگے بڑھانا چاہیے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ عربی رسم الخط کو رومی رسم الخط میں بدل دینا چاہیے، اُن کا ایک اور دائرہ عمل یہ تھا جس میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت وکردار کے بارے میں اُن نکات کو اچھالا جن سے عام ذہن میں اسوہ رسول کا اچھا تاثر نہ جا سکے اور لوگ اُس مقصد کو سنجیدگی سے نہ لیں جو آنحضرت محمد ﷺ کے پیش نظر تھا۔ اُن کی سر توڑ کوشش تھی کہ وہ اسلامی تہذیب وثقافت کی تعمیر وترکیب میں بیرونی عناصر کی کارفرمائی کو ثابت کر سکیں تا کہ اسلامی تہذیب وثقافت کو مجموعہ خرافات قرار دیا جا سکے۔

چنانچہ اُن کے تمام تر مطالعہ کا تعلق اپنے اہداف اور عزائم سے تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ حکمت عملی تبدیل ہوتی رہی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین جذباتیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر عقلیت علیت اور استدلال کے اسلوب نظر سے آشنا ہوتے رہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی گہری بدنیتی اور مخالفت ومخاصمت کا اظہار رفتہ رفتہ سلیقے سے کیا جانے لگا اور اسلام کے مقابل میں اُن کے تعصب وتظلم کا پھیلاؤ بھی نسبتاً کم ہوتا گیا۔ مختصر یہ کہ مستشرقین کا رویہ ہر زمانے میں یکساں نہیں رہا اور اسی لیے اُن کے ہاں علم، تجربہ، اندازِ استدلال، مذہبی حیثیت اور وابستگی کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں اسی لحاظ سے اُن کے فکر وفن اور تحقیق وتالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے۔

دراصل یہ بحث لایعنی ہے کہ تحریک استشراق کا آغاز کب ہوا اس لیے کہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہود و

نصاریٰ کے اسلام سے بغض وعناد کا آغاز ظہورِ اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریک استشراق کے ایک باقاعدہ نظم اختیار کرنے سے قبل بھی اہل مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبر اسلام کے خلاف بالخصوص بغض وعداوات کا اظہار موقعہ بہ موقعہ تاریخ کے مختلف ادوار میں ظاہر ہوتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ وفورِ جذبات سے سرشار رومی، بازنطینی، لاطینی، مسیحی اور یہودی روایتیں صدیوں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں، افواؤں کے دوش پہ سفر کرتی رہیں اور کبھی کبھار تحریر وتصنیف اور وقائع واسفار کے قالب میں ڈھلتی رہیں اور اُن کی آئندہ نسلوں کا سرمایہ افتخار قرار پائیں۔ چنانچہ ظہورِ اسلام کے بعد کوئی چار ساڑھے چار سو سال تک اسلام اور بانی اسلام کے حوالے سے اُن کی مخالفت ومخاصمت کا عام انداز یہی رہا۔ اور اس تمام عرصہ میں بلکہ اس کے بعد بھی مغربی دنیا اس قابل نہ ہو سکی کہ وہ حقائق وواقعات کا صحیح ادراک حاصل کر سکے اور مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے۔

اس کا بظاہر ایک ہی سبب نظر آتا ہے کہ اُن کے دلوں میں بھرا بغض اُن کو صحیح اسلامی معلومات اور پیغمبر اسلام کی حقیقی سیرت تک جانے ہی نہ دیتا تھا اور نہ ہی تاریخ کے اُس دور میں اصل اسلامی ماخذ تک رسائی اتنی آسان تھی ۔ چنانچہ اُن کے دلی تعصب، سنی سنائی باتوں ، غلط فہمیوں اور خود ساختہ مفروضات نے انھیں اس قابل ہی نہ رکھا تھا کہ وہ اسلام کی حقیقی اور اجلی تصویر کا سامنا کر سکتے۔ اُس پہ مستزاد وہ کشمکش تھی جو اِن اقوام اور اسلام کے مابین استوار ہوتی رہی۔ اور اُن کی شکستیں اُن کے دلوں کے بغض میں اضافہ کرتی رہیں۔ پھر آنے والی صدیوں میں صلیبی محاربات کا سلسلہ دشمنی اور عداوت کا ایسا نشہ اُن پر طاری کر گیا جو آج تک نہیں اترا۔ حتیٰ کہ 2001ء میں جب امریکی جڑواں ٹاورز کو جہازوں سے اڑا دیا گیا تو ردعمل میں خطاب کرتے ہوئے امریکی صدر جارج بش نے اس واقعہ کو پھر سے صلیبی جنگوں کا آغاز قرار دے دیا۔ امریکہ نے اپنی طرف سے تو صلیبی جنگ کا آغاز کر دیا مگر کوئی مسلمان ملک اس قدر طاقتور نہ تھا جو اُس کے مقابل کھڑا ہوتا۔

مگر یہ آج کی بات ہے اور ہم تاریخ کی بات کر رہے ہیں جب صلیبی جنگوں کے ہر معرکے میں شکست ہی صلیبیوں کا مقدر تھی اور اسلام وہ مضبوط پتھر تھا جس سے سر ٹکراتے ٹکراتے صلیبی لشکر پاش

پاش ہو گئے اور تاریخ کے صفحات میں صلیب کے سامنے ایک بدترین شکست کو لکھ دیا گیا۔ اور شاید اُن کی یہی شکست اس بات کا زبردست محرک بن گئی کہ تحریک استشراق کو بپا کیا جائے کیونکہ وہ جان چکے تھے میدان جنگ میں فی الوقت مسلمانوں کو شکست دینا مشکل ہے اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف فکری محاذ کھول لیا جس کے تحت انھوں نے مسلمانوں کو ذہنی، فکری اور عقائدی شکست دینے کا عزم کیا۔ ذہنی اور فکری محاذ پر انھوں نے کچھ کامیابیاں ضرور حاصل کیں مگر قرآن و سنت کی موجودگی میں وہ اسلامی عقائد میں تحریف کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ حالانکہ وہ اپنی کتابوں کے ساتھ ایسا کر چکے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ایک دن قرآن کو بھی بدل دیں گے مگر اُن بد قسمتوں کو شاید علم ہی نہ تھا کہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ تو خود خالق نے اٹھا رکھا ہے اس لیے اِس محاذ پر اُن کو بدترین شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

تاہم جب کوئی برائی کی ٹھان ہی لے تو سنت اللہ یہی ہے کہ اُس کی رسی دراز کر دی جائے۔ چنانچہ جذبات اور بہیمت میں اندھے مغربی دانشور نے اسلام کے بارے میں وہ تصوراتی منظر وضع کرنا شروع کیا جو نہایت کریہہ تھا اور جس کا نہ تو اسلام کے ساتھ کوئی تعلق تھا اور نہ آنحضرت محمد ﷺ کی ذات مبارکہ سے ہی اُس کو کوئی نسبت تھی مگر صلیبی جنگوں میں کھائے زخموں سے رستے لہو اور مسلم تلواروں کے گہرے گھاؤ جب اُن کو اذیت دیتے تو وہ اپنی اس اذیت کو کم کرنے کے لیے چاند پر تھوکنے کی کوشش کرتے جس کے نتیجے میں دنیا کا سب سے پست ادب تخلیق ہونے لگا اور اُن کا ہدف رسول اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ تھی۔

اول تو اِن مستشرقین کے پاس رسول اللہ ﷺ کی زیست مبارکہ کے بارے میں حقیقی علم ہی نہ تھا مگر شاید انھیں اس علم کی ضرورت بھی نہ تھی اس لیے کہ اُن کے گندے ذہن کی غلاظت اُن کی تحریروں کا عکس بن کے سامنے آ رہی تھی۔ خیالی قیاسی، افسانوی، دیومالائی کہانیوں کے تانے بانے سے رسول پاک ﷺ کا جو عکس انھوں نے اپنی اقوام کے سامنے پیش کیا اِس کا اسلام کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا بلکہ وہ آگے بڑھ کر خطہ ارض کا بہت بڑا دین بن گیا۔ مگر اِس افسانہ طرازی کا نقصان اُن کی اپنی اقوام کو اٹھانا پڑا کہ وہ کئی صدیوں تک اندھیرے میں چلی گئیں۔ اُس دور کا سارا مغربی ادب جس میں اسلام

اور پیغمبر اسلام کے متعلق کوئی بات کی گئی تھی وہ پست ذہنوں کی اختراع تھی، کذب وافتراء کا پلندہ تھا، بے حقیقت اور من گھڑت افسانے تھے جن کی کوئی اصل نہ تھی۔ دینے کو سینکڑوں مثالیں ہیں جو یہاں تحریر کی جاسکتی ہیں مگر قلم لرزتا اور دل ڈوبتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں وہ باتیں تحریر کی جائیں ۔وہ الزمات ، وہ تخیلات ، وہ اتہامات ، وہ منکرات ، وہ مکروہات، وہ امکانات وہ احساسات، وہ جذبات، وہ مقامات، وہ خیالات اس قابل نہیں کہ انھیں سیرۃ المزمّل میں جگہ دی جائے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ کوئی پست اخلاق کسی بلند اخلاق کو گالیاں دے رہا ہے تو بلند اخلاق کا کیا بگڑنا ہے جو کچھ بھی بگڑنا ہے وہ پست اخلاق کا ہی بگڑنا ہے۔ اول اول جان آف دمشق نے اس روایت کا آغاز کیا وہ بازنطینی تھا اور پست اخلاقی میں حد سے بڑھا ہوا تھا ۔ یورپ میں (Guillaume postal) کو مستشرقین کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

پوسٹل نے پہلے تو تحریک استشر اق پر خوب تنقید کی اور اس کے بعد اُن کے لیے نئی راہ عمل تجویز کی جسے بہت سے لوگوں نے اپنا لیا یوں یہ غلیظ قافلہ بننے لگا۔ رائمنڈ لل (Rayomond lull) نے بھی اپنی قوم کو مشرقی علوم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ اور بہت سے لوگ طالب علموں کا چولا پہن کر اندلس وصقیلہ کی عظیم الشان درسگاہوں میں داخلہ لینے لگے۔ کیونکہ وہ جان چکے تھے کہ اپنے مقاصد میں اُس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ عربی زبان میں مہارت حاصل نہ کرلیں۔ (Guillaume postal) خاص لغت وزبان کا ماہر تھا اُس نے پینتالیس سال تک اپنی قوم کی خدمت کی اُس کے بعد اُس کے ایک لائق شاگرد (Josepgh Scaliger) نے اُس سلسلے کو رکنے نہ دیا اور اپنی زندگی اس امر کے لیے وقف کردی کہ تحریک استشر اق سے منسلک لوگ عربی زبان میں مہارت پیدا کریں تا کہ مسلمانوں کے خزانے میں نقب لگائی جاسکے۔ یہ تحریک چلتی رہی مگر اُس کا کوئی مرکزی نظم موجود نہ تھا۔

پھر سولہویں صدی عیسوی میں عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے باہم الحاق کرلیا تب تحریک استشر اق کو بھی از سر نو منظّم کیا گیا اور اب وہ ایک مرکزی نظم کے تحت کام کر رہی تھی۔ تحریک استشر اق کو مرکزی نظم فراہم کرنے میں ڈیوک آف تسکانی (Duke of Tuscany) نے اہم کردار ادا کیا اور یہ

تحریک اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں کوشاں ہو گئی۔ یہ وہ مختلف آرا تھیں جو اوراقِ تاریخ سے ہم تک پہنچیں مگر حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ استشراق کا آغاز دسویں صدی سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور اس بات کے بہت سے ثبوت مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ مگر اس علمی اور قلمی تحریک کو جس بری طرح سے تصورِ اسلام کو مسخ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا وہ اہلِ مغرب کی ذہنی پستی کا ثبوت ہے۔ دراصل اس تحریک کا آغاز ساتویں صدی عیسوی سے ہی ہو گیا تھا جب اکثر عیسائی پادری اور راہب اس راز کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے جو مسلمانوں کی طاقت کا محور تھا۔

جس کے سامنے قیصر و کسریٰ جیسی عظیم سلطنتیں ریت کے گھروندے ثابت ہوئیں وہ اس تہذیب و ثقافت کی ترقی کے اسباب معلوم کرنا چاہتے تھے جس نے کئی تہذیبوں اور ثقافتوں کو دیکھتے ہی دیکھتے نگل لیا تھا۔ جب اندلس پہ مسلمانوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا اور انھوں نے وہاں علوم و فنون کو رواج دیا تو راہبوں اور پادریوں کی ایک بڑی تعداد بھی اس سے مستفید ہونے لگی۔ ان کو دراصل کوئی علمی پیاس نہ تھی بلکہ ان کے سینوں میں اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نفرت کا ایک آلاؤ دہک رہا تھا جس کو بجھانے لیے ہی وہ یہ مصنوعی علمی چولا اوڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی کمزوریاں جاننے اور اس برتر تہذیب کو نیچا دکھانے کے لیے نجانے کیا کیا بھیس بدلے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگیاں اسلام کے علوم حاصل کرنے اور پھر اسلام کی تردید کرنے کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ مستشرقین کی اکثریت اپنے مقاصد پر محکم یقین رکھتی ہے۔ ان کے مقاصد میں وقت کے تقاضوں کے ساتھ تبدیلی آتی رہتی ہے مگر اسلام دشمنی کا بنیادی مقصد کبھی ان کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتا۔

یہ لوگ کبھی مصر پر حملے کے وقت نپولین بونا پارٹ کے ہمراہ نظر آتے ہیں تو کبھی اسلامی ممالک میں مغربی استعمار کی راہ ہموار کرتے نظر آتے ہیں اور کبھی استعمار کے خلاف اٹھنے والی آزادی کی تحریکوں میں استعماری حکومتوں کے مشیر بن کر حق نمک ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ متعصب مستشرقین کا یہ طبقہ مسلمانوں کے خلاف صیہونی تحریک سے بھی الحاق کر لیتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اسے الحادی طاقتیں بھی اسلام کے مقابلے میں کم خطرناک نظر آتی ہیں۔ مستشرقین کے اس طبقے کا پھیلایا ہوا زہر

ملت اسلامیہ کی اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر چکا ہے۔ملت اسلامیہ جتنی جلدی اس حقیقی خطرے کا سدِ باب کر لے اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہوگا۔تحریک استشراق بارہ سو سال سے جتنی محنت اور مشقت سے اپنے عزائم کی طرف گامزن رہی ہے آج اس کے نتائج بھی دیکھنے کو مل رہے ہیں۔

توانائی کے تمام بنیادی اثاثہ جات کی ملکیت کے باوجود جس طرح آج کا مسلمان مغربی استعمار کے آگے جھکا ہوا نظر آتا ہے یہ دراصل تحریک استشراق کا ہی ثمر ہے جو نہ صرف یہ کہ ایک علمی اور قلمی تحریک تھی بلکہ وہ اب ایک ہمہ پہلو تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہے اور اب اس کی پشت پر نہ صرف کہ یہ ان کا قدیمی نصب العین موجود ہے بلکہ وسائل کی وہ بے پناہ قوت بھی اب ان کو حاصل ہے جو کل تک مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔مگر آج کا ہر مسلمان حکمران اپنی الگ حکومت کا مفاد ہی دیکھ سکتا ہے اور اس کے پیش نظر امت کی تجدید نو کا کوئی تصور ہی سرے سے موجود نہیں ہے۔

آج امت مسلمہ کو تحریک استشراق جیسی کسی بڑی اور منظّم علمی تحریک کی ضرورت پہلے سے بہت بڑھ چکی ہے کہ ایک آفاقی نظام ونظریہ کی موجودگی میں امت کی پستی کا کوئی علمی جواز تو بہر حال موجود نہیں اگر کہیں کوئی بگاڑ ہے تو وہ یقیناً مسلمان کے عمل اور کردار میں ہے کہ اس نے اسوہ رسول ﷺ سے منہ موڑ کر اپنی ذلت خریدی ہے اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد میں وقار سے عاری زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔صلیبی جنگوں میں پے در پے شکستوں کے بعد تحریکِ استشراق نے جہاں اپنی قوم کے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا وہیں اس نے اسلام دشمنی کے بہت سے نئے اسلوب بھی دریافت کیے جو بعد میں استعماری اور استبدادی نظام حکومت کی بنیاد بنے اور دنیا ایک نئے نظام جبر کے زیر تسلط آ گئی۔مستشرقین کی اس تحریک کو وقت کے مورخ نے کئی ادوار میں تقسیم کیا ہے جو اس تحریک کی شدت اور تعصب کو ظاہر کرتے ہیں۔

ذیل میں ہم تحریک استشراق کے ارتقائی ادوار کا تفصیلی جائزہ لیں گے تاکہ آج کا نوجوان مسلمان اس تحریک کے مقاصد اور پس پردہ عوامل تک رسائی حاصل کر سکے اور یہ جان سکے کہ آج کے متمدن دور میں بھی ایسے لوگ بستے ہیں جو بظاہر تو مہذب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر جن کا طریق چاند پر

تھوکنے جیسا ہے اگرچہ ایسی گری ہوئی حرکات سے چاند کی عظمت اور رفعت میں کوئی بھی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسد جیسی شدید بیماریوں میں ملوث کچھ لوگ آج بھی اسی طرزِ فکر پہ گامزن ہیں ذیل کی سطور میں انھی لوگوں کی نارسائیوں کے فسانے پنہاں ہیں۔



تحریک استشراق کا دورِ جہالت

تحریکِ استشراق کا دورِاول ان تاریکیوں کا غماز ہے جن میں اہلِ مغرب ٹھوکریں کھاتے پھرے۔سارا یورپ اس وقت ظلم جبر و جہالت اور کلیسا کے اس وحشیانہ تسلط کے تحت سسک رہا تھا جس کی مثل انسانی بہیمت کے کسی اور دور میں تلاش کرنی مشکل ہے۔دوسری طرف انھی ایام میں مسلمانوں نے یورپ اور افریقہ کے کئی علاقوں میں علم و حکمت کے چراغ روشن کر دیئے تھے جن کی روشنی اہلِ مغرب کو دعوتِ نظارہ دینے لگی تھی اور وہ کھلی آنکھوں سے اُس انقلاب کے ثمرات کا مشاہدہ کر رہے تھے جو سسلی سے لے کر اندلس تک پھیلا ہوا تھا۔چنانچہ اہلِ مغرب اور کلیسا نے بھی اپنے رویوں میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔عیسائی پوپ اور راہب جوق در جوق اندلس کے ان علمی مراکز کا رخ کرنے لگے جو اندلس میں علم کی روشنی بکھیر رہے تھے۔انھوں نے اپنی علمی کم مائیگی کا ادراک حاصل کیا اور درست سمت میں قدم اٹھائے سب

سے پہلے انھوں نے مسلمانوں کے علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔تراجم کے اس کام میں ہر قسم کا مواد شامل تھا۔چنانچہ فلسفہ، ریاضی، طب، علم ہیت اور دیگر علوم عقلیہ کی بہت سی کتابیں یورپی زبانوں میں منتقل ہوگئیں۔مگر بہت سے مستشرق جن کی منزل اور مقصد صرف اور صرف اسلام دشمنی تھی انھوں نے خاص اسلامی علوم کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں قرآنِ حکیم اور سنت مطہرہ سمیت بہت سے دوسرے اسلامی علوم اہل مغرب کی توجہ کا مرکز رہے اور ان عیسائی مبلغین نے علوم اسلامیہ میں کافی بلند درجہ حاصل کرلیا تھا۔انھوں نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ مسلمانوں کی تقلید میں جا بجا علمی ادارے قائم کیے۔اس دور کے عیسائیوں اور چرچ نے اپنی علم دشمنی کی روش کو بھول کر جب اس راز کا کھوج لگالیا کہ مسلمانوں کی تہذیبی معاشی سماجی اور اخلاقی برتری کا راز علم میں پنہاں ہے تو انھوں نے یورپ اور اسپین کے شہریوں کو علم کی دولت سے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا اور بڑے پیمانے پر ایسے اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا جہاں علمی تحقیق وجستجو کی نئی تاریخ رقم ہونا شروع ہوئی۔تب اہل مغرب میں بھی بہت بڑے بڑے علماء سامنے آئے جن کی جہد وسعی سے جدید اور متمدن یورپ کی بنا رکھی جاسکی۔تفصیل میں جائے بغیر ہم ذیل میں ان بڑی شخصیات اور اداروں کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنھوں نے بعد کے آنے والے ادوار پر دور رس علمی اور عملی اثرات مرتب کیے۔

طلیطلہ یونیورسٹی:

۱۱۳۰ء میں طلیطلہ کے حکمران نے کثیر خرچ سے علاقے میں اس دارالترجمہ کی بنیاد رکھی جس نے بعد میں کئی سو سال تک اسپین، برطانیہ، اٹلی اور جرمنی کے طلبا کی علمی ضروریات کو پورا کیا۔وہ طلیطلہ آتے اور عربی تہذیب وثقافت سے متعلقہ علوم سیکھتے اور واپس اپنے ممالک میں جاکر اس علمی نور کو پھیلانے میں مصروف ہوجاتے۔

"Don Ramond" نے اس ادارے کی بنا رکھی۔ اس بڑے ادارے میں مسلمان عیسائی اور یہودی علماء مل جل کر باہمی محبت کے ساتھ ارتقاء علم میں مصروف رہتے۔ انھوں نے ریاضی، علم فلکیات، طب، کیمیا، طبعیات، تاریخ، نفسیات، سماجیات اور سیاسیات جیسے جدید علوم پر بنیادی کام کیے اور اسی ڈھانچے پر آج کی متمدن اور جدید دنیا کی بنا رکھی ہے۔

****

کلینہ فرانس:

اس ادارے کی بنیاد 1539ء میں رکھی گئی۔ گیام پوسٹل (Guillaume postal) کو اس ادارے کی سربراہی سونپی گئی۔ بنیادی طور پر اس ادارے کا مقصد مسلمانوں کے عظیم الشان علمی کام کو

یورپی زبانوں میں منتقل کرنا تھا۔ گیام فرانسیسی مستشرق تھا اُسے اپنی زبان دانی پر اس قدر ناز تھا کہ وہ کہتا کہ میں ایشیا سے لے کر چین تک بغیر کسی مترجم کے سفر کر سکتا ہوں۔ عربی کے علاوہ اُسے بہت سی دیگر زبانوں میں بھی مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ کلینہ فرانس میں اُسے عربی کی چیئر عطا کی گئی۔ اس ادارے کے لیے اخراجات ڈیوک آف تسکانی نے ادا کیے۔ مغرب کی انھی کوششوں نے اُس فضا کو جنم دیا جس میں کئی صدیوں تک اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیاں، بیہودہ الزامات واتہامات اور تشکیک وتذبذب کے بیج بو کر خرافات کا ایسا جنگل اُگا دیا گیا جیسے کاٹنا آسان نہ تھا برسہا برس کے اس پروپیگنڈے نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے بارے میں اس قدر راسخ کر دیا کہ آج تک مغرب اسلام کے مقابل خم ٹھونکے کھڑا ہے۔ یہی حسد وبغض تھا جو انھیں اُس سماجی نظام تک لے گیا جہاں اسلام کو

نقصان پہنچاتے پہنچاتے وہ خود اپنے دین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

****

پطرس محترم:

اس کو محترم لکھتے ہوئے اچھا تو نہیں لگتا کہ اوراقِ تاریخ نے اس کے متعلق جو معلومات مہیا کی ہیں اس کی بنا پر وہ قطعاً کسی احترام کے ہرگز لائق نہیں مگر اس ستم ظریف مستشرق نے اپنا نام ہی کچھ ایسا رکھا ہے جس کو پورا لکھنا قواعد تحریر کی مجبوری ہے۔ پطرس محترم کا تعلق فرانس سے تھا اور وہ ایک راہب تھا۔ پھر اس نے ایک اصلاحی تحریک کا آغاز کیا جس نے یورپ بھر کی عیسائیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس نے اپنے گرد بہت سے اہل علم کو جمع کیا اور ایک ایسی تنظیم کی بنیاد رکھی جس نے علوم مشرقیہ اور اسلامی علوم کو مغربی زبانوں میں منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ ''Robret Tesster'' بھی اسی کے گروہ میں شامل تھا جس نے قرآنِ حکیم کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ بھی اس تنظیم نے بہت سی کتابوں کے تراجم کیے جنھوں نے ''مجموعہ کلونی'' کے نام سے شہرت پائی۔ پطرس اپنے لوگوں سے کہا کرتا کہ وہ عام آدمی نہیں ہے بلکہ قدرت نے اسے خاص مشن پر اس دنیا میں بھیجا ہے جس کے بنیادی اجزا یہ ہیں۔

اول یہ کہ دنیا سے عیسائیت کے سوا تمام مذاہب کا خاتمہ کرنا خاص طور پہ اسلام اور یہودیت کا مکمل خاتمہ اس کے پیش نظر تھا۔

دوم یہ کہ یورپ میں بیداری کی اس لہر کا مقابلہ کرنا جس نے کلیسا کو فکری اضطراب اور انتشار میں مبتلا کر رکھا تھا۔

سوم یہ کہ کلیسا کے نظام کو اتنا مستحکم بنانا کہ وہ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کر سکے۔

پطرس محترم اور اس کی جماعت نے ایک طرف تو قرآنِ حکیم اور دوسرے عربی علوم کے ترجمے کا کام شروع کر رکھا تھا تو دوسری طرف وہ اپنی قوم کو صلیبی حملوں کی دعوت بھی دے رہے تھے۔پطرس اور اس کی جماعت ایسی پالیسی پر کاربند رہے جس کے نتائج دیر سے نکلتے ہیں مگر زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

پطرس خود اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اے اہلِ قوم اگرچہ تم کو میری کوششیں بے فائدہ نظر آتی ہیں کیونکہ اس طرح کے اسلحہ (یعنی کتابوں اور تراجم) سے دشمن کو بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچتا مگر میرا موقف یہ ہے کہ جس طرح ایک عظیم بادشاہ اپنے ملک میں جو چیزیں جمع کرتا ہے ان میں سے کچھ دفاع کے لیے ہوتی ہیں اور کچھ زیب و زینت کے مگر کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو یہ دونوں مقاصد پورے کرتی ہیں۔گو اُن میں سے ضروری نہیں کہ ہر چیز ہر زمانے میں استعمال ہو۔چنانچہ میری اِن کوششوں کی مثال بھی کچھ ایسی ہی ہے کہ میں یہ جانتا ہوں کہ ان کوششوں سے مسلمانوں کو عیسائی نہیں بنایا جاسکتا مگر ان کے عقائد میں تذبذب کی کیفیت تو پیدا کی جاسکتی ہے۔

اس لیے ایک عالم کا کم از کم یہ فرض تو بنتا ہی ہے کہ وہ اپنے ان ہم مذہب بھائیوں کی مدد کے لیے کچھ کرے جو کمزور ہیں اور انھیں تھوڑی سی کوشش سے ان کے دین سے بدظن کیا جاسکتا ہے۔یہ تھے پطرس کے خیالات جس کی بنا اس تعصب پر رکھی تھی جس پہ آج کا مغربی عالم بھی اسی ذوق وشوق سے قائم ہے جو صدیوں سے اُن کی روایت رہی ہے۔پطرس محترم کے بارے میں اس کا اپنا ہی ایک ساتھی اس کے متعلق یوں اظہارِ خیال کرتا ہے کہ پطرس ایک خردماغ فوجی تھا۔بعض وجوہات کی بنا پر اس کی روحانی زندگی اضطراب کا شکار تھی وہ ایک متعصب راہب تھا جس کو تاریخ نے پطرس محترم بنا دیا۔اگرچہ تاریخ نے اُس کے تعصب کو پوشیدہ نہیں رکھا مگر ایک عالم جانتا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی سے لے کر زمانہ حال تک مسلمانوں پر مصائب کے جو پہاڑ نازل ہوئے ہیں، ہزاروں کلمہ گو صلیبی جنگوں کی نظر ہوئے یا ان کے دلوں سے اپنے دین کی لگن اور محبت کمزور ہوئی اور وہ اپنی بنیادی اساس سے دور ہو کر ملحد تہذیبوں کی

تقلیدی روش پہ جا نکلے تو اس کے پیچھے پطرس محترم جیسے کتنے ہی لوگوں کی مساعی تھی۔ پطرس محترم اور اس کے ساتھیوں نے قرآن مجید کا جو ترجمہ کیا وہ علمی بد یانتی کی بدترین مثال ہے جس میں قرآن کے پیغام کو اس حد تک مسخ کرنے کی کوشش کی گئی کہ بعد کے آنے والے علماء اس کو ترجمہ قرآن قرار دینے پر بھی رضامند نہ تھے۔ مستشرقین کا یہ قافلہ اپنے مقاصد سے لگن کی بنیاد پر اپنی توانائیاں خرچ کرتا رہا اور اور ان میں کتنے ہی ایسے نام ہیں جو تاریخ کے صفات نے محفوظ رکھے، جیری دی اورلیاک، ڈان ریمنڈ دیرکلونی، جیرار دی کریمون، رابرٹ آف تشتر، ایڈلر آف باتھ، ھرمان الدماطی، مائیکل سکاٹ راجر بیکن، ریمنڈلل، فریڈرک ثانی، الفانسو دہم، وغیرہ تحریکِ استشراق کے ہراول دستے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کے بعد بھی تحریک استشراق اپنے مقاصد کے حصول میں گامزن رہی اور آج تک ان کی یہ مساعی جاری ہے ۔اس کی صورتیں اور طریقہ کار میں بدلتے وقت کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں مگر دین اسلام سے ان کا تعصب آج بھی اسی معیار کا ہے جس کی مثالوں سے تاریخ کے صفحات سیاہی مائل ہیں۔



تحریک استشراق کا وسطی دور

روزِ اول سے تحریکِ استشراق کا بنیادی مقصد دین اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا ہی رہا ہے۔ مگر اس وسطی دور میں مستشرقین نے جو غیر اخلاقی اور غیر انسانی رویہ اپنایا وہ ان کی اخلاقی پستی پہ ہمیشہ کے لیے ایک دلیل کے طور پہ ثبت ہو کے رہ گیا۔ اس لیے کہ اب کی بار انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی تحقیق کا ہدف نہیں بنایا بلکہ ان پہ الزام تراشیوں اور ان کی کردار کشی کا رویہ اپنایا۔ دراصل وہ صلیبی جنگوں میں پے در پے شکستوں کی وجہ سے انتہائی ذلت محسوس کر رہے تھے اور اس اخلاقی تنزل پہ اتر آئے تھے جو کسی بھی علمی تحریک کو زیب نہیں دیتا۔ اگرچہ روزِ اول سے ہی ان کے پیشِ نظر اسلام کی روشن تعلیمات پہ اندھیرے اور غلط فہمی کی دبیز تہہ چڑھانا تھا مگر خاص اس دور میں انھوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہی کو نشانے پر رکھا اور فرضی تصویری کہانیوں

افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے ذریعے سے اپنے مقاصد کی تکمیل کی راہ اپنائی۔ انھوں نے آپ ﷺ کی ذات و کردار آپ ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کے پیروکاروں کی کردار کشی میں ہر اخلاقی جواز کو نظر انداز کرتے ہوئے محض اپنے مقاصد پر نظر رکھی۔ ایک بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام دشمنی میں غیر علمی غیر اخلاقی اور متعصّبانہ رویہ صرف اسی دور کے ساتھ خاص نہیں بلکہ مستشرقین کی اس علمی بدیانتی اور اخلاقی تنزل کی جھلک ہر دور کے مستشرقین کے کام میں نظر آتی ہے۔ بلکہ گزشتہ کئی سالوں سے اس میں شدت ریکارڈ کی جا رہی ہے جو مغرب کی علمی اور اخلاقی پستی کی دلیل ہے۔ جیسا کہ ڈنمارک اور ناروے کے صحافیوں کی کارٹون مہم اور برطانوی و امریکی فلم نویسوں کی پردہ اسکرین پہ ہرزہ سرائی کی کوششیں۔ چنانچہ تحریکِ استشراق کے اس تاریخی موڑ پر مستشرق تحریر و تصویب کے وہ کہنہ اسلوب بھی بھول بیٹھا جو کسی علمی تحریک کا سرمایہ تصور کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ دورِ اول کے مستشرقین کے ہاں بھی اسلام دشمنی کی اس بو کو بدرجہ اُتم محسوس کیا جا سکتا ہے کہ جب انھوں نے اسلامی علوم کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا اور پھر ان علوم کو اپنے معاشروں میں پھیلانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تب بھی وہ اسلام کو اس انداز سے پیش کرتے جیسے وہ عیسائیت ہی کی ایک شاخ ہو اور مسلمان انھی کے دین کا کوئی بھٹکا ہوا گروہ ہو۔

اسی مقصد اور نظریے کو نظر میں رکھتے ہوئے یوحنا دمشقی نے اسلامی علوم پر کتابیں لکھیں اور پطرس محترم نے قرآنِ حکیم کا وہ ترجمہ کیا جسے علمی بدیانتی کی بدترین مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم دورِ اول کے مستشرقین اسلام پر اعتراض کرنے اور اس کی اصل ہیت کو متاثر کرنے کے لیے پہلے خود اسلامی علوم میں مہارت حاصل کرتے اور پھر اسی مہارت کی بنا پر وہ خود اسلام کی تاریخی روایات اور تعلیمات ہی سے مثال اخذ کر کے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کرتے مگر دوسرے دور کے مستشرقین نے نہ اسلامی علوم کی طرف توجہ کی نہ اس میں مہارت پیدا کی اور نہ ہی انھوں نے عربی زبان سیکھنے کی کوشش کی اس لیے انھوں نے اسلام اور نبی کریم ﷺ کی ذات کے حوالے سے جو بھی دعویٰ کیا اس کی بنیاد کسی اخلاقی اور علمی جواز پر نہ رکھی بلکہ صرف اپنے تخیل کی پرواز پر تکیہ کیا۔ ان کے لیے بس یہی کافی تھا کہ اسلام ایک بڑی برائی ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ کو وہ ہر برائی کا محور تصور کرتے۔ اس لیے وہ اس بات کو

اپنے عقیدہ کا حصہ تصور کرتے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جو چاہیں اور جس طرح چاہیں لکھیں۔ چاہے اس سے خود ان کی جگ ہنسائی ہوئی اور بعد کے مستشرقین ان کی صفائیاں پیش کرتے پھریں۔ یاد رہے کہ کسی بھی دور کے مستشرقین کے حوالے سے زمان ومکاں کا حقیقی تعین کافی مشکل ہے۔ اس لیے کہ مشرق کی طرف سے مغرب کو علوم کی منتقلی کا سلسلہ بھی صدیوں جاری رہا اور صلیبی جنگیں بھی صدیوں پر محیط ہیں اس لیے یہ ممکن ہے کہ گیارہویں اور بارہویں صدی کے مستشرقین کے کام اور خیالات کا عکس نویں دسویں صدی کے مستشرقین کے ہاں بھی پایا جاتا ہو کہ دراصل اس پوری عمارت کی بنیاد ایک تسلیم شدہ اور معروف اصول یعنی اسلام دشمنی پر رکھی گئی تھی۔

چنانچہ اس دور کے مستشرقین نے اپنی تحریروں اور دوسری اصناف میں اسلام کے بنیادی تصور اور تعلیمات کو مسخ کرنے کی ارادی کوششیں کی ہیں۔ اور وہ اس میں اتنے آگے بڑھے کہ بعد کے مستشر قین کو ان کے اس انداز سے خفت اٹھانی پڑی اور وہ اپنی تحریروں میں اس دور کے مستشرقین کو کذب بیان قرار دیتے رہے۔ مگر یاد رہے کہ بعد کے مستشرقین کے ہاں ندامت اور خفت کا جو اظہار کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اسلام کے بارے میں منصفانہ رویے کو ضروری سمجھتے تھے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ علمی ترقی کے اس دور میں اس قسم کی فرضی داستانیں اور الزام تراشیاں اسلام کی نسبت خود تحریکِ استشراق کے لیے نقصان کا باعث تھیں اور سابقہ دور کے مستشرقین کا غیر علمی اور غیر منطقی انداز خود تحریکِ استشراق کے لیے منفی تاثرات کو اجاگر کر رہا تھا۔

چنانچہ اپنے زمانے کا مشہور مستشرق (Montgomery Watt) جس نے اگرچہ خود بھی تصورِ اسلام کو بھرپور طریقے سے مسخ کرنے کی کوششیں کی ہیں اپنی کتاب (Muhammad Prophet and Statesman (PBUH)) میں گزشتہ ادوار کے مستشرقین کے رویے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو بدنام کرنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں اتنی کوششیں تاریخِ انسانی کی دوسری عظیم شخصیت کو بدنام کرنے کے لیے نہیں کی گئیں۔صدیوں اسلام کو عیسائیت کا سب سے بڑا دشمن تصور کیا جاتا رہا اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کو اسلام کے علاوہ کسی منظّم طاقت سے واسطہ نہ پڑا تھا جو کہ اتنی ہی طاقتور ہو جتنے کہ مسلمان تھے ۔عربوں کے ہاتھوں اپنے چند بہترین صوبوں سے ہاتھ دھونے کے بعد بیزنطینی حکومت کو ایشیائے کوچک اسپین اور سسلی میں بھی اسلام کا چیلنج درپیش تھا اور مسلمانوں کو ارض مقدس سے نکالنے کی صلیبی کوششوں سے پہلے ہی یورپ میں ''اسلام دشمن اعظم ہے'' کا تصور جڑ پکڑ چکا تھا۔بارہویں صدی عیسوی میں صلیبی فوجوں کے اذہان میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو تصورات تھے وہ بڑے مضحکہ خیز تھے جنھوں نے ان کے اخلاق پہ بھی منفی اثرات مرتب کیے''۔

****

مونٹ گمری واٹ ہو یا فلپ کے ہٹی اسی کوشش میں مصروف عمل نظر آتے ہیں کہ کسی طرح دورِ اول کے مستشرقین کے دامن سے وہ داغ صاف کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو ان کی علمی بد یانتی کا مظہر ہیں۔انھوں نے اپنے پیشروؤں کے غیر منطقی فلسفے کو غلط فہمی قرار دینے کی بے حد کوشش کی ہے مگر تاریخ کے آثار ان کی تمام کوششوں پر پانی پھر دیتے ہیں اس لیے کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی ہے ہر دور میں ان کی اکثریت مذہبی لوگوں پر مشتمل تھی اور اہل کتاب کا کوئی عام آدمی چاہے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی لاعلمی کی بنا پر اختلاف کرتا ہو مگر اہل کتاب کے علماء قطعاً کسی غلط فہمی کا شکار نہ تھے بلکہ ان کی مخالفت ارادی تھی جس پر قرآن حکیم بھی گواہ ہے اور اس نے صدیوں پہلے اس حقیقت کا اعلان فرما دیا تھا کہ :

اَلَّـذِيْنَ اٰتَيْنٰـهُـمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُـنَـهٗ كَمَا يَعرِ فُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ O وَاِنَّ فَرِيْقًا
مِّـنـهُـمْ لَيَكْـتُـمُـوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعلَمُـوْنَO

(القرآن الحكيم)

ترجمہ؛

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ پہچانتے ہیں انھیں (محمد رسول اللہ ﷺ کو) جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بے شک ایک گروہ ان میں سے چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کر''۔

****

حقیقت یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کے سامنے تب اس کے سوا اور کوئی رستہ ہی نہ بچا تھا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف غیر انسانی اور متعصّبانہ رویہ اپنائیں کیونکہ اُن کو اِس حقیقت کا حتمی ادراک حاصل تھا کہ اسلام کی سورج کی طرح چمکتی تعلیمات کے مقابلے میں ان کی تحریف زدہ تعلیمات نہ ٹھیر سکیں گی اور لوگوں تک اگر تصورِ اسلام اپنی حقیقی روشنی کے ساتھ پہنچ گیا تو پھر کوئی قوت انھیں اسلام کے دامن میں پناہ لینے سے نہ روک سکے گی۔ اس لیے انھوں نے تصورِ اسلام کو مسخ کرنے اور اس کی اصل ماہیت کو خراب کرنے پہ ہی اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدیوں اہلِ مغرب کے اذہان میں مسلمان کا تصور عجیب سا تھا کہ آج بھی مغرب کے بعض لوگوں کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بھی اسی خدا کی پوجا کرتے ہیں جس کی پوجا یہودی اور عیسائی کرتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے خدا کے بارے میں ان لوگوں کے ذہن میں مستشرقین کی جہدِ مسلسل نے کچھ اس طرح کا تصور قائم کیا تھا کہ وہ اس کو بت پرستوں کی کوئی دیوی یا دیوتا تصور

کرتے تھے اور بعض لوگ خیال کرتے کہ مسلمان اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی مقام دیتے ہیں جو عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیتے ہیں۔اصل صورت حال یہ ہے کہ مستشرقین کی تحریکِ استشراق کے حقیقی مقاصد اور ان کی ہمہ پہلو جدوجہد تک پہنچنے کے لیے بہت باریک نگاہ کی ضرورت ہے جس سے آج کا مسلم دانشور تساہل برت رہا ہے جس کے اثرات امت کی مجموعی ہیت اور نظام فکر کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ فکری طور پہ مغربی علوم کی یلغار کے مقابل کسی درجے میں احساس کمتری کا شکار ہے اور ملت اسلامیہ میں ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو مستشرقین کی مساعی کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔وہ نہیں جانتے کہ بظاہر شہد کی اِن گولیوں میں وہ زہر ہے جو مسلمان کے عقائد پہ اثر انداز ہوتا ہے جو اس کی کُل متاع ہے جس کی ایک مثال سلیمان رشدی بھی ہے۔

یہ ملعون ایک مسلمان کے گھر پیدا ہوتا ہے اس کا نام مسلمانوں سا ہے مگر جب تحریکِ استشراق نے اس کو کرایہ پہ حاصل کر لیا تو اُس نے اُن لوگوں کی مذموم خواہش کو پورا کیا۔سلیمان رشدی غلیظ کے سیاہ کارنامے کو اس پہلو سے دیکھیں کہ اس نے چند بکواس کیے تو یورپ اور امریکہ کے میڈیا نے اس کو اتنا اچھالا کہ ناپاک سلیمان رشدی اور اس کے ناپاک الفاظ شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے ۔چنانچہ اس کی کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اہل مغرب آج بھی اسی طرح کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں جس میں اسلام تصورِ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کی گئی ہو۔اگر چہ بہت سے اہل علم تحریکِ استشراق کو صلیبی جنگوں کا ردِعمل قرار دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ استشراق کی جڑیں بہت گہری ہیں اور صلیبی جنگوں سے پہلے بھی ان کی سعی کے نشانات ملتے ہیں۔

اگر چہ اس دور میں وہ غیر منظّم اور ناتواں تھے۔صلیبی جنگوں نے البتہ اس طرزِ عمل کو بامِ عروج تک پہنچایا۔بعد کی صدیوں میں گو اس طرزِ عمل کو ختم کر کے اسلام کے بارے میں مثبت رویہ اپنانے کی کوشش ضرور کی گئی مگر وہ قدیمی طرزِ فکر اور طرزِ عمل مکمل طور پہ ختم نہ ہو سکا بلکہ اس کے وجود کا ثبوت اہل مغرب کے ہاں سے آتا ہی رہتا ہے کبھی وہ بنگلہ دیش کی کسی خاتون کو بے پناہ مالی وسائل کے عوض

اس بات پہ راضی کر لیتے ہیں کہ وہ نظریہ اسلام پہ طعن کا فریضہ انجام دے تو کبھی ناروے ڈنمارک اور سویڈن کے صحافی آزادی اظہارِ رائے کے قانون کی حقیقی اساس کو روندتے ہوئے مکروہ افعال میں مصروف عمل نظر آتے ہیں۔



تحریک استشراق، لامتناہی تسلسل

تحریک استشراق کے حوالے سے سترہویں اوراٹھارویں صدی عیسوی کوخاص اہمیت حاصل ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب اس تحریک کے برگ وبار نے پھل دینا شروع کیا اور مسلمان زوال کی راہ کو چل دیئے۔ سترہویں صدی کو مورخین یورپ کے عصر جدید کا مطلع قرار دیتے ہیں۔ یورپ کی جدو جہد ،سعی وکاوش اور حریت وآزادی کا آغاز اسی عہد سے ہوتا ہے۔ سترہویں صدی کو عروج استعمار کی صدی بھی کہا جاتا ہے جس نے رفتہ رفتہ عظیم الشان اسلامی ریاست کونگل لیا۔ یورپ میں بیداری کی ایک بڑی لہر نے جنم لیا اور اُن عوام حکمرانوں سمیت اُس علم کی طرف متوجہ ہوگئے جو مسلمان علماء کی ہزار سالہ کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ چونکہ علم کا یہ سارا ذخیرہ عام طور پر عربی زبان میں ہی تھا اس لیے اہل مغرب نے بڑی دلجمعی کے ساتھ مسلمانوں کی زبان سیکھی اور مسلمانوں کے علمی ورثے سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ اہل مغرب نے کئی ایسے عالم پیدا کیے جنھوں نے عربی زبان میں بے پناہ مہارت

حاصل کی۔انھی میں سے ایک کا نام(Erpenius 1554-1624)بیان کیا جاتا ہے۔ارپی نیس نے عربی زبان کی پہلی لغت مرتب کی تاکہ اُس کی قوم کو مسلمانوں کی زبان تک رسائی میں آسانی حاصل ہو سکے۔ایک اور ماہرِ زبان آسٹریا کے(Lorriunuer Franz)نے بھی عربی زبان کے قواعد و لغت و ترتیب کا گراں قدر کام کیا۔مزید براں (D,Herbelot) کی سربراہی میں 1680ء میں ایک ایسا ادارہ قائم کیا گیا جس کا مقصد اسلامی علوم اور تہذیب و تمدن کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا تھا۔سترہویں صدی کی ایک خاص بات

یہ ہے کہ اس صدی میں جن مستشرقین نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت پہ کام کیا انھوں نے عامیانہ خیالات اور قصے کہانیوں کے بجائے قدرے سنجیدہ کام کیا۔اس صدی میں گویا مستشرقین کے رویہ اور سلوک میں اس تبدیلی اور فرق کی اصل وجہ گویا اُن کے ماخذ کے بدل جانے میں مضمر تھی کہ اب کے انھوں نے اہلِ عرب کی تاریخ کا مطالعہ کر لیا تھا۔

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سترہویں صدی کے مستشرقین کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے کوئی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ وہ جانتے تھے کہ اب اُن کی خرافات کو تسلیم کرنا ممکن نہ رہا تھا۔تاہم اس کے باوجود مستشرقین موقع بہ موقع معلوماتِ سابقہ کے مصالحہ کے استعمال سے نہ چوکتے تھے۔چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کے روایتی لاطینی اور بیزنطینی مواد کی سیاہیوں میں اسلامی اور عربی مصادر نے روشنی پیدا کی اور انھوں نے اس تضاد کو جان لیا تھا جو سیاحوں کے سفرناموں کے اندراجات،اُن کے تصورات اور اصل حقائق کے مابین پایا جاتا ہے۔اس عہد میں بھی حسب سابق مطبوعات اور تصنیفات بہت کم ہیں تاہم بالکل بھی مفقود نہیں ۔سترہویں صدی کے معروف مستشرقین میں اِن لوگوں کو شامل کیا جاتا ہے۔

☚ ولیم بیڈل (Bedwell.w) ایک انگریز مستشرق تھا جس کا زمانہ (1632-1561ء)بیان کیا گیا ہے۔اُس کی بہت سی کتابیں اب نابود ہو چکی ہیں تاہم اُس کی دو کتابوں کے نشان اب بھی ملتے ہیں۔اُن میں سے ایک تو عربی لغت ہے جو سات

جلدوں پہ مشتمل تھی اور ایک رسول اللہ ﷺ کی سیرت پہ کتاب تھی جس کو دوبارہ سے (1965ء) میں لندن سے شائع کیا گیا۔ سیرت رسول پہ یہ کتاب انتہائی گستاخانہ ہے اورویلم بیڈل (Bedwell.w) نہایت بدبخت اور گستاخ شخص تھا۔

****

☛ وائٹر (Vattiar p) ایک فرانسیسی مستشرق تھا۔ اُس کو عربی زبان میں بے پناہ مہارت حاصل تھی۔ پھر مستشرقین کے ایک بڑے ادارے نے اس کی خدمات حاصل کر لیں جس کے تحت وائٹر نے عربی علوم کے بہت کثرت سے فرانسیسی زبان میں ترجمے کیے۔

****

☛ ڈاکٹر ہنری اسٹب (Dr, Henry Stubbe) سترہویں صدی کا معروف مستشرق تھا۔ اُس نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت پہ ایک عمدہ کتاب لکھی جس کا نام (An Account of the rise and progress of Mohakmmetanism) بیان کیا گیا ہے۔ اگر اس کتاب کی کچھ تاریخی غلطیاں نظر انداز کردی جائیں تو اس کتاب کو قدرے معقول اور معتدل کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسٹب نے اپنی اسی کتاب میں اپنے پیشروؤں کی جہالت پہ شدید تنقید کی ہے۔ اُس نے مستشرقین کی اکثر و بیشتر تصنیفات کو مکروہ قرار دیا اور کہا کہ اس آسمان کے نیچے محمد ﷺ کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو تمام دنیائے انسانیت کی توجہ کا مرکز بنی ہو۔ یہ کتاب گویا مغرب کی جانب سے سیرت رسول کے بارے میں اولین اعتذار تھا۔ مشرق میں اسٹب کی اس کتاب کو کافی شہرت حاصل ہوئی اگرچہ اہل مغرب نے اس کو چنداں اہمیت نہ دی۔ اسٹب کے کا زمانہ (1631- 1676ء) بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت پہ اُس کی مشہور کتاب (1911ء)

میں لندن سے شائع ہوئی۔

****

☚ ہانجر (Hottinger J.H) سوئٹزرلینڈ کا ایک مستشرق تھا جو (1620ء) میں پیدا ہوا۔ اُس نے بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقانیت چھپانے کے لیے اپنی زندگی وقف کیے رکھی۔ اُس کی کتابیں اگرچہ وقت کی راکھ میں گم ہو چکیں تاہم اس قدر ضرور معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی بدبختوں کے اُس قافلے سے متعلق تھا جنھوں نے سورج کی روشنی روکنے کی کوشش میں اپنی زندگیوں کو حسرت کا نشان بنا لیا تھا کہ سورج کی روشنی بھلا کسی سے رُک سکتی ہے۔ ہانجز کی ایک کتاب ابھی تک مل جاتی ہے جسے (1958ء) میں ہائیڈل برگ نامی ادارے نے شائع کیا۔ یہ دراصل تو ایک شماریاتی تصنیف تھی جس میں مشرقی علماء کی تصانیف کی فہرست مرتب کی گئی تھی۔ وہ (1667ء) میں انتقال کر گیا۔

****

☚ جین بررڈ (Genebarad) کا زمانہ اگرچہ (1535ء) تھا مگر اُس کا موقف سترہویں صدی میں عام ہوا۔ وہ ایک مشہور کیتھولک مناظرہ باز تھا۔ جین برڈ کہتا ہے کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) نے آخر قرآن عربی زبان میں ہی کیوں لکھا جبکہ اُس وقت کئی متمدن زبانیں جیسے کہ عبرانی یونانی اور لاطینی زبانیں موجود تھیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ محمد (ﷺ) ایک ہی زبان سے واقف تھے جو اُن کے مخصوص وحشیانہ ماحول سے مطابقت رکھتی تھی اس لیے انھوں نے اسی زبان میں قرآن لکھا۔ (1597ء) میں

یہ بدزبان مرگیا۔

****

الیگزینڈر روس (Alexander Ross) نے (1653ء) میں اپنی جو کتاب شائع کرائی وہ اگرچہ تقابل ادیان کے موضوع پہ ایک کتاب تھی مگر اسی کتاب میں ایک حصہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں بھی آگیا۔ اس کتاب کا معیار قدرے بہتر تھا حالانکہ اسی الیگزینڈر کی اس سے قبل شائع ہونے والی ایک کتاب نہایت پست تھی جس میں روائتی قصے کہانیوں اور قرون وسطیٰ کے روائتی خرافاتی مواد پہ انحصار کیا گیا تھا۔

****

لینسلوٹ ایڈیسن (Lanceiot Addison) بھی بدبختوں کے قبیلے سے تھا اور سخت گستاخ تھا۔ اُس نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے نام سے جن خرافات سے دنیا کو آشنا کیا وہ خود اُس کے باطن کی عکاس تھیں۔ (1667ء) میں اس کی یہ کتاب شائع ہوئی جس کا نام (The first State of Mohammentanism) رکھا گیا۔ یہ کتاب سراسر خرافات کا پلندہ تھی۔ اخلاقی پستی کا شاہکار تھی، مستشرقین کے بغض وعناد کا عکس تھی۔ کچھ سالوں بعد لینسلوٹ ایڈیسن (Lanceiot Addison) نے اپنی اسی کتاب کو ایک نئے نام (The life and deth of Mohammad) سے شائع کیا۔

****

☚ اور دیکھیں کہ یہ مستشرق ہمفرے (Humpheey pr ideaux) کا رسول اللہ ﷺ سے سب سے بڑا شکوہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کو اپنی زندگی میں ہی شائع کیوں نہ کرایا۔ اب اِس لعنتی سے کوئی کیا کہے بلکہ اُس کو صاحب علم سمجھنے والوں کی عقل پہ کوئی کہاں تک ماتم کرے کہ اُس کی کتاب کو دو صدیوں تک معیاری کتاب مانا جاتا رہا۔ ایک ہی سال میں اُس کے کئی کئی ایڈیشن نکلتے رہے۔ اُس کی کتاب کا فرانسیسی میں بھی ترجمہ میں کیا گیا بدقسمتی سے اُس کی کتاب کا نام میں نہیں جانتا۔

****

اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوران بھی تحریک استشراق ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہی۔ البتہ سفر جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا، رختِ سفر کم و بیش ہوتا رہا اور اپنے تمام تر مذہبی، مشنری، سیاسی اور استعماری عزائم کے علی الرغم مستشرقین کے رویہ میں لچک اور نرمی پیدا ہوتی گئی۔ اس نرمی اور لچک کا مطلب صرف یہ ہے کہ اِن میں سے چند کا رویہ رنگ و آہنگ اور آواز و انداز بدلا اور نسبتاً انصاف پسندی سے کام لیا۔ بلکہ دل و نگاہ میں گنجائش پیدا کر کے اثبات و معروضیت (Objectivity) سے آگے بڑھ کر توصیف و مدح (Admiration) اسلام و پیغمبر اسلام میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ورنہ پرانے خیالات اور اُن کے متقدمین کے قائم کیے ہوئے نظریات بہر حال گرم سفر رہے اور انھیں مقبولیت بھی حاصل رہی۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ متعصّبانہ اور متشددانہ رویہ کے ساتھ ساتھ معقولیت اور انصاف پسندی کا رجحان بھی عام ہونے لگا۔ اس رجحانِ نو کا آغاز اٹھارھویں صدی کے پہلے عشرے میں ولندیزی مستشرق ریلان (H.Reland) سے ہوا جس نے 1704ء میں (De Religione Mohammadica) لکھی جس نے بہت سے مستشرقین کو آگ بگولا کر دیا کہ اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کے بارے میں کافی احتیاط اور احترام سے کام لیا گیا تھا۔ مزید براں اِس کتاب کو لکھتے وقت اصل عربی ماخذ سے رجوع کیا گیا جس کی وجہ

سے یہ ایک معقول کتاب قرار پائی۔ ریلان (H.Reland) نے برملا کہا کہ ہم مشرق کو اُس کے اصل ماخذ کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ مورخ کا تعصب اُس کے کلام کو پست کر دیتا ہے اس لیے مورخ کو ہمیشہ غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ اسی نظریے کے مطابق ہمیں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق کچھ کہنا چاہیے۔ حسن اتفاق سے اُسی عہد کے کئی دیگر لوگ اسی نکتہ نظر کو اجاگر کرنے والے دستیاب ہو گئے جس کی وجہ سے مستشرقین کے حوالے سے اٹھارہویں صدی عیسوی کو اعتدال کی صدی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ریلان (H.Reland) کے اس عدل پسند نظریہ کو پیری بائل (Pierye Bayle) اور بولین ویلیرز (Boulainvilliers) نے آگے بڑھایا اور مستشرقین کے قبیلے کو عدل کی طرف بلایا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی میں ہی مستشرقین کی ذاتی وانفرادی کاوشوں سے ہٹ کر سرکاری اور اجتماعی سطح پر بھی کچھ ایسے اقدامات کیے گئے جو جھوٹے اور غلیظ مستشرقین کا راستہ روکتے تھے۔

اس سلسلے میں اہل مغرب کو بعض مجبوریوں کا سامنا بھی تھا اس لیے کہ اُن کی سیاسی وعسکری قوت اب انھیں اُن ممالک پہ قبضے کے لیے اکسا رہی تھی جہاں مسلمان بستے تھے اس لیے اہل مغرب یہ چاہتے تھے کہ مذہب کے حوالے سے اُن کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے اس لیے انھوں نے کچھ ایسے اقدامات کیے جن سے مسلمانوں اور مسیحی دنیا کے مابین پائی جانے والی وسیع خلیج کو کم کیا جا سکے۔ اُن اقدامات کے نتیجے میں مشرقی ممالک میں السنہ المشرقیہ کے عنوان سے بہت سے ادارے قائم کیے گئے۔ مشرق میں کتب خانوں کی بنیاد رکھی گئی، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کی گئیں، مشرقی تصنیفات کی طبع واشاعت کا اہتمام کیا گیا، تعلیمی ادارے قائم کیے گئے، بڑے بڑے خیراتی ہسپتال کھولے گئے۔ چنانچہ مشرقی ممالک میں اور ینٹلسٹ کی کثیر تعداد نے وہ جماعت پیدا جس نے مغربی اقوام کے مشرق پر مکمل تسلط میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ہی استشراق اور مستشرق کی اصلاحات پہلی بار منظر عام پہ آئیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اٹھارہویں صدی کے کچھ مستشرقین کا احوال بیان کر دیا جائے۔

☚ سائمن اوکلے(Ocklay.S) ایک انگریز مستشرق تھا، مستشرقین اپنی اُن تحریروں کو جو کسی خاص موضوع پہ خالصتاً تحقیقی نقطہ نگاہ سے لکھی جائیں وہ اُن کو عام لوگوں کے لیے مشتہر نہ کرتے ۔ بلکہ ایک خاص حلقے تک محدود رکھتے تاہم سائمن اوکلے نے مسلمانوں کی تاریخ پہ جو کتاب (History of the Saracens) لکھی وہ 1718ء میں شائع ہوئی اور پہلی بار مستشرقین کے تحقیقی نتائج کو عام لوگوں کی رسائی کے قابل بنایا گیا۔ یہ کتاب تین جلدوں میں تھی جس میں عام لوگوں کے لیے عمدہ تحقیقی مواد موجود تھا۔ سائمن اوکلے(Ocklay.S) کا زمانہ 1678ء تا 1720ء ہے۔

****

☚ ایڈورڈ پوکاک(Pocock,G) بھی ایک انگریز مستشرق تھا، اس نام کے کئی مستشرق سترہویں صدی میں بھی گزرے ہیں جن سے اشتباہ گزر سکتا ہے، ایڈورڈ پوکاک نسبتاً معتدل مستشرق تھا اُس کا زمانہ(1647ء تا 1727ء) ہے۔

****

☚ جارج سیل (Sale,G) بھی ایک انگریز مستشرق تھا۔ 1734ء میں اُس نے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا، چار صدیوں قبل کیے جانے والے قرآن حکیم کے اس ترجمے کے بارے میں تو کوئی حتمی رائے پیش نہیں کی جاسکتی تاہم اُس کی دوسری کتابوں سے اس قدر ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ نہایت بدتمیز اور بد بخت شخص تھا۔ اِس دور کے مستشرقین کی تحریروں کو نسبتاً معتدل قرار دیا جاتا ہے اس لیے جب کئی مستشرقین کی معتدل تحریریں سامنے آئیں تو جارج سیل(Sale,G) کو اس کا بہت رنج ہوا جس کا اظہار اُس نے رسول اللہ ﷺ کی ذات پہ گند

اچھال کے کیا۔

****

جین گینیئر (Gagnier,j) بھی ایک انگریز مستشرق تھا۔جس کا زمانہ 1697ء تا 1736ء تک تھا۔اس نے دو کتابیں شائع کیں اِن دونوں کتابوں کا مقصد بولین ویرو کی تالیف کو کم کرنا تھا ۔ بولین ولیر کے مقابلہ میں اُس نے ایک نئ تالیف (Vie de Mohammed) لکھی ۔ یہ کتاب 1748ء کو ایمسٹرڈم سے شائع ہوئی ۔ جین گجینئیر معتدل مستشرق تھا۔

****

جے رسک (Reiske, JJ) ایک جرمن مستشرق تھا ۔ جے رسک کا زمانہ 1774ء تک ہے۔ جہاں وہ اپنی زبان کا سکالر تھا وہیں عربی زبان پہ اُس کی دسترس کا یہ عالم تھا کہ اُس نے عربی زبان کی کلاسیکی لغت تیار کی۔اس کے ساتھ ساتھ وہ یونانی زبان وادب پہ بھی سند مانا جاتا تھا۔

****

ایڈورڈ گبن (Gibbon,E) ایک انگریز مورخ تھا۔اُس کا زمانہ 1794ء تک تھا۔اُس کی کتاب (تاریخ زوالِ رومہ) نے بہت شہرت حاصل کی۔اسی کتاب کے پچاسویں باب میں اسلام اور آنحضرت محمد ﷺ کے بارے میں نہایت دلسوز رائے کا اظہار کیا گیا اور اُس

روایتی بے حسی سے کام لیا جس کا عکس اکثر مغربی مصنفین کا ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

****

☚ والٹیر (Voltaire Fr.) فرانسیسی مصنف تھا۔پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں اُس نے ایک ڈرامہ تحریر کیا جس نے بہت شہرت حاصل کی حالانکہ یہ ڈرامہ کی روایتی خرافات پہ مبنی تھا اور اس بات کا غماز تھا مستشرقین شریعت اسلامی سے یکسر ناواقف تھے ، یہ ڈرامہ 1742ء میں منظر عام پہ آیا۔اُس نے نہ صرف اسلام کے خلاف نفرت وحقارت کا اظہار کیا بلکہ ساتھ ہی معتدل مستشرقین پہ شدید تنقید کی۔اُس نے اپنے ڈارمے کو وقت کے پوپ کے نام منسوب کیا اور اس کے مقدمے میں اسلام کے خلاف خوب زہر اُگلا اُس نے رسول اللہ ﷺ کی ذات کے بارے میں جو کچھ کہا قلم اُسے لکھنے سے گریزاں ہے۔مختصر یہ ذہن میں رہے کہ والٹیر ایک بدتہذیب اور بدبخت شخص تھا۔



تحریک استشراق انیسویں صدی میں

انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اول تک کا زمانہ مسلمانوں اور مستشرقین دونوں کے لیے متعدد اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ پچھلی صدیوں میں عالم اسلام کو دنیا کے مختلف حصوں میں سقوط و انحطاط کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا ایک تو اُن کے سبب ہی مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت ختم ہوئی اُس پہ مستزاد یہ کہ اُن کے پرانے حریف یعنی اہل مغرب کو سیاسی، معاشی اور ثقافتی ہر میدان میں تفوق و بالا دستی حاصل ہوتی چلی جا رہی تھی اور اس کی سامراجی گرفت عہد بہ عہد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے اُدھر عالم اسلام خستہ و نزار ہوا اور اِدھر مغرب کا پرچم استعمار مزید بلند ہوا۔ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے کیسی ہی اذیت ناک کیوں نہ رہی ہو اقوام مغرب کے لیے بہر حال خوش آئند تھی اور تاریخ میں پہلی بار مستشرقین کے قبیلے کو بھی اپنے خواب پورے کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ

انیسویں صدی سے تحریک استشراق اپنے عروج کی جانب مائل ہوئی اور اسی عہد میں تحریک استشراق کو بھرپور فروغ حاصل ہوا۔ مستشرقین کے انداز اگرچہ اب بدل چکے تھے تاہم کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے ہی وہ اپنے اسلاف پر بازی لے گئے۔ کمیت کا اندازہ تو اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ زیرِ بحث دور میں مستشرقین کی بہت بڑی تعداد سامنے آئی۔ اِن میں ہر قسم کے مستشرق شامل تھے جو خاموش صلیبی جنگ کے اس محاذ پر یورپ کے تقریباً تمام علاقوں کی نمائندگی کرنے والے تھے، چنانچہ اس گروہ میں فرانس، اٹلی، انگلستان، اسپین، پرتگال، آسٹریا، ہالینڈ جرمنی ڈنمارک، سوئیڈن، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، چیکوسلواکیہ، روس، بیلجیم، فن لینڈ اور امریکی مستشرق شامل تھے اور کیفیت کو دیکھیں تو بھی اس عہد میں مستشرقین نے تصنیف و تالیف کے ڈھیر لگا دیئے۔ اُن کے مطالعہ کا دائرہ بہت وسعت اختیار کرچکا تھا۔ اگرچہ پہلے اُن کی تحقیق و تدقیق کا دائرہ محدود تھا مگر اب کے تو انھوں نے عقائدِ اسلام، قرآن و حدیث، سنت و فقہ، اجتہاد، عرب اور اہلِ عرب کے احوال، ترکوں اور عربوں کی باہمی مخاصمت، اسلام کی حقیقت و اصلیت، اسلامی تہذیب و تمدن اور پیغمبرِ اسلام کی سیرت و سوانح پہ اس کثرت سے لکھا گیا کہ تاریخ کی کسی اور صدی میں اس قدر نہ لکھا گیا ہوگا۔ اِس دور میں مستشرقین کا معیارِ تحقیق و استدلال بھی بلند ہوا۔ تحقیق و جستجو اور تفتیش و تفحص میں انھوں نے ایسا کمال کردکھایا جو آج بھی باعثِ حیرت ہے۔

قدیم عربی مآخذ کی تلاش، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت، آثار و اکتشافاتِ قدیمہ کا مطالعہ کتابوں کی تصحیح و اشاعت، اسلامی تاریخ کے مآخذ کی ترتیب و تدوین، فہرستوں، اشاریوں اور تبویب وغیرہ کی تیاری اور اسی طرح کی دوسری علمی سرگرمیاں اُن کی محنت و ریاضت، علم شناسی اور مشرق نوازی کا ثبوت پیش کرنے لگی تھی۔ اُن کی یہ سرگرمیاں مسلمانوں پر بھی کسی احسان سے کم نہیں کہ اسی جہد و سعی کی بدولت بہت سی نادر اور مفقود الخبر کتابیں پھر سے مسلمانوں کی دسترس میں آگئیں جس سے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس دور میں مستشرقین کے رویہ اور سلوک میں بھی نکھار پیدا ہوا اور بحیثیت مجموعی اِس دور میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام سے بھی اُن کا رویہ ایک اخلاقی دائرے میں آتا چلا گیا۔ مختلف عوامل کے نتیجے میں اس دور کا مستشرق، نرم خو، حقیقت پسند اور کسی حد تک معقولیت پسندی

کی طرف مائل رہا۔ اِس کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ انھوں نے اپنی تحریروں سے قبل مشرقی مصادر، عربی علوم اور اسلامی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کے نتیجے میں اِس دور کے مستشرق کی تحریروں میں محض تخمین وظن اور قصہ گوئی کی بجائے عقل واستدلال اور علم کی روشنی میں بات سامنے آنے لگی۔ مشرقی ممالک کے مشاہدات واسفار نے اُن کے اپنے اسلاف کی لغویت کو ثابت کر دیا تھا اور بیان و واقعہ کا تضاد کھل کے سامنے آ گیا تھا۔ دوسری بڑی وجہ شاید خود یورپ کے اندرونی حالات تھے اُس کی بدلتی ہوئی فضا تھی۔ نیز جدت پسندی، سائنسی ایجادات واختراعات، تعصب وتقشّف کے خلاف عام بے چینی، رومانی تحریک، کلاسیکی نظریات کے خلاف بغاوت، تاریخی تنقید کی تحریک وغیرہ جیسے کئی عوامل بھی شامل تھے جنھوں نے اس دور کے مستشرق کے ذہن میں تبدیلی پیدا کی۔ اِن باتوں کی روشنی میں گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ مستشرقین کی اس فکری تبدیلی کی تہہ میں نہ تو کسی قسم کا اخلاص جلوہ گر تھا اور نہ کدورت ونفرت پر محبت ومودت کے جذبات غالب آ گئے تھے بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ وقت کی ستم ظریفی نے مستشرق کے ذہن کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ورنہ تحریک استشراق کے مقاصد میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ تاہم وہ اخلاقی روایت ضرور مستحکم ہوئی جس کے نتیجے میں اب کے مستشرق کی تحریروں میں لغویات، تخمین وظن اور قصہ گوئی کم ہو گئی تھی اور اتہامات والزامات کا دائرہ سمٹ گیا تھا۔ نیز کلیسا کا طلسم کمزور ہو جانے کی وجہ سے مستشرقین کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو چکا تھا جنھوں نے جرأت سے کام لے کر اپنے پیش رو مصنفین کی تغلیط کی اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق اُن کی پھیلائی ہوئی یاوہ گوئی سے شرمندہ دکھائی دیئے۔

اپنی سرگرمیوں کو منظم ومرتب کرنے کے ضمن میں مستشرقین نے اِس دور میں متعدد تحقیقی ادارے قائم کیے جنھوں نے اُس کا بگاڑ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جو اُن کے پیش رو اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ اِس دور میں جو تحقیقی ادارے وجود میں آئے اُن میں سوسائٹی ایشیاٹک آف پیرس (1822ء)، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ (1823ء) اور امریکن اورینٹل سوسائٹی (1842ء) وغیرہ شامل ہیں۔ اِن اداروں نے جلد ہی اپنے اپنے جرائد کا اجرا کر دیا جن سے اس تحریک کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی۔ چونکہ لوگوں کے اذہان وقلوب کو متاثر کرنے میں

رسائل و جرائد کو ہمیشہ سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے اس لیے متذکرہ بالا مجلّات کی اشاعت کو ہی کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اس عمل کو اپنی حکمت عملی کا مستقل حصہ بناتے ہوئے مستشرقین نے کئی دوسرے رسائل و جرائد کا اہتمام بھی کیا جن میں ہندوستان سے 1891ء میں (The Muslim Word) کا اجراء ۔ 1895ء میں پیرس سے (Revaed-el-Islam) کا اجراء اور 1912ء میں روس سے Mir,Islam کا اجراء قابل ذکر ہیں۔

اِن رسائل و مجلّات کی اشاعتی سرگرمیوں کا مقصد بظاہر تو یہ تھا کہ وہ اپنی تحقیقات سے دوسروں کو روشناس کرا سکیں لیکن بہ باطن مدعا اپنے پرانے استشراقی مقاصد کی تکمیل ہی تھا۔ رہی اُن کی بلند آہنگی تو وہ اقوام عالم پہ یورپی اقوام کی بالادستی کا نتیجہ تھی۔ ساتھ ہی استعماری اور سامراجی تسلط کا عکس بھی۔ چنانچہ مستشرقین کو چونکہ اب ریاستی پشت پناہی بھی حاصل ہو چکی اس لیے انھیں وسائل کی کوئی کمی نہ تھی جس کے نتیجے میں جلد ہی مستشرقین نے دنیا کے ہر مستشرق کو ایک پلیٹ فارم پہ جمع کرنے کی سعی کی اور پہلی عالمی کانگرس منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ چنانچہ 1873ء کو پیرس میں مستشرقین کی پہلی عالمی کانگرس منعقد ہوئی۔ حسب توقع مستشرقین کے لیے عالمی کانگرس کا انعقاد بہت مفید ثابت ہوا۔ مختلف اداروں کی سرگرمیاں کارکردگی، نتائج، اطلاعات کا تبادلہ، نصب العین کا تعین، بڑے بڑے علماء و فضلاء کی شرکت مقالات ، خیالات، خطبات، قراردادیں اور بہت کچھ جس نے تحریک استشراق کو فعال اور متحرک کر دیا تھا۔ انیسویں صدی سے ہی مستشرقین کے عالمی سالانہ اجتماعات کو ایک روایت کے طور پر جاری کر دیا گیا۔ اسی وجہ سے اس دور کو تحریک استشراق کا عروج کمال بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں تحریک کے تمام شعبوں میں ترقی کی رفتار انتہائی تیز ہو گئی مستشرقین کا رویہ اور سلوک نکھرتا چلا گیا اور بحیثیت مجموعی اُن کی تمام سرگرمیاں بہت منظّم طریقے سے ہر سطح پر اپنے اثرات ظاہر کرتی رہیں۔ انیسویں صدی کے کچھ نامور مستشرقین کا تذکرہ یہاں مفید مطلب ثابت ہوگا۔

☚ جان جاک سیدیلو (Sedillot.j.j) ایک فرانسیسی مستشرق تھا۔ اُس کا زمانہ

1832ء کا ہے۔اُس نے متعدد یادگار کتابیں اپنے پیچھے چھوڑیں جو مستشرقین کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد و معاون ثابت ہوئیں۔جان جاک نے تاریخ عرب پر بھی ایک یادگار کتاب لکھی تھی۔

****

دیورجے (Desvergers A.N) کا تعلق بھی فرانس سے ہی بتایا جاتا ہے۔وہ ایک مشہور مورخ تھا، اُس نے بلادِ عرب پر کئی سیر حاصل مباحث چھوڑے ہیں۔مسلمانوں کی خلافت کی تاریخ بھی بیان کی ہے، علاوہ ازیں اُس نے ہندوستان پر مسلمان حکمرانوں کی حکومت اور عہد مغلیہ کی تاریخ پر بھی ایک مفید کتاب تحریر کی تھی، مشہور مسلمان مورخ ابی الفداء کی تاریخ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔اُس نے 1867ء کو انتقال کیا۔

****

ڈاکٹر پیرون (Perron A.) فرانسیسی مستشرق تھا۔وہ ایک ماہر مترجم بھی تھا چنانچہ اُس نے نساء العرب قبل واسلام و بعد کا ترجمہ کیا۔ایک مسلمان مورخ جلال الدین ابی سلیمان داؤد کی کتاب طب نبوی کا بھی فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ۔ ڈاکٹر پیرون (Perron A.) کی مزید کتابوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جنھیں ہم طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں۔ڈاکٹر پیرون (Perron A.) 1886ء میں انتقال کر گیا۔

****

☚ گارسن دی تاسی (Tassy, Garcin, de) بھی ایک فرانسیسی مستشرق تھا۔کئی کتابوں کا مصنف تھا، دین اسلام پہ اُس کا مطالعہ گہرا تھا، اُس نے قرآن کے علاوہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیمات اور سنت کو بھی اپنا موضوع بنایا تھا۔اسلامی تعلیمات کے متعلق اُس کا تصور ایسا ہی جاہلانہ تھا جیسا کہ اُس کے پیشروؤں کا تھا ۔ گارسن دی تاسی (Tassy, Garcin, de) نے 1887ء میں انتقال کیا۔

****

☚ جوزف وھائٹ (White j.) برطانوی مستشرق تھا۔اُس نے اسلام اور نصرانیت کا تقابلی مطالعہ کیا اور نصرانیت کو اسلام سے برتر ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کی ۔ اسلام اور پیغمبر اسلام پر بھی اُس کی کافی تحریریں ملتی ہیں۔تاہم اُن میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔وہی خام خیالی اور افسانہ آرائی ہے جو مستشرقین کا طریقہ کار رہی ہے۔جوزف وھائٹ (White j.) نے 1814ء میں انتقال کیا۔

****

☚ ولیم رائٹ (Wright,W) برطانیہ کا رہنے والا تھا۔کئی کتابوں کا مصنف تھا اُس کی بہت سی کتابیں اب نہیں ملتیں اور جو ملتی ہیں وہ اس قابل نہیں کہ اُن کی طرف توجہ کی جا سکے ۔روایتی مستشرق تھا جس میں کوئی نئی بات نہ تھی اُس نے 1889ء میں انتقال کیا۔

****

- ایڈورڈ ہنری پامر(.Palmer, E.H) کا تعلق برطانیہ سے تھا وہ ایک مترجم تھا، اُس نے قرآن حکیم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا تھا جسے 1880ء میں آکسفورڈ پریس نے شائع کیا۔ ایڈورڈ ہنری پامر(.Palmer, E.H) نے 1883ء کو انتقال کیا۔

****

- ڈی جونگ(Jong,P,de) ہالینڈ کا رہنے والا تھا۔ وہ مستشرقین کے ایک گروہ میں شامل تھا جو مل کر کام کرتے تھے۔ اُس نے اپنے ایک ساتھی مستشرق ڈی جوجے(Goege M.j de) کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام پہ کام کیا تھا انھوں نے مسلمانوں کی اس مقبول ترین کتاب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اُن کے اس علمی کام کو مطبع لیڈن نے 1881ء میں شائع کیا تھا۔ ڈی جونگ(Jong,P,de) نے 1890ء کو انتقال کیا۔

****

- ڈی جوجے(Goege M.j de) کا تعلق بھی ہالینڈ سے تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا تھا جو 1881ء میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں ڈی جوجے(Goege M.j de) نے کثیر التصانیف وفیات الاعیان از ابن خلکان پر کام کیا۔ ہالینڈ کے اس مستشرق کا انتقال 1909ء میں ہوا۔

****

☚ فلا یشر(Fleischer, H.I) جرمن مستشرق تھا۔وہ ایک صاحب علم شخص تھا اور اُس نے کئی کتابیں لکھی تھیں ۔ بہت سی کتابوں کے ترجمے کیے۔اسی طرح تاریخ ابی الفدا ءکو متن وترجمہ کے ساتھ شائع کیا ۔اسے تعلیقات اور حواشی سے مزین کیا۔لیبزگ نے اِس کتاب کو 1831ء میں شائع کیا۔فلا یشر نے تاریخ عرب قبل از اسلام کے عنوان سے بھی ایک بھی لکھی جسے علمی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔اِس کتاب کو بھی مطبع لیبزگ نے 1931ء میں شائع کی۔فلا یشر کا انتقال 1888ء میں ہوا۔

****

☚ ویسٹنفیلڈ(Wustenfeld,F) کا تعلق بھی جرمنی سے تھا بہت صاحب علم شخص تھا جس نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں ۔ جیسا کہ تاریخ مکہ مکرمہ، سیرت ابن ہشام کا ترجمہ، اراضی مدینہ منورہ، اور تاریخ الاشراف مکہ وغیرہ اُس کی یادگار کتابیں ہیں ۔ اُس کا انتقال 1899ء میں ہوا۔

****

☚ بیریزین(Bresine,N.) کا تعلق روس سے تھا۔اُس کو روسی مستشرقین کا سرخیل بھی کہا جاتا ہے۔اُس نے متعدد کتابیں لکھیں، جن میں مصادر اسلامی، تہذیب وتمدن اور اسلام کے تعلق وغیرہ پر کئی لاجواب کتابیں لکھیں جن کو علمی حلقوں میں خوب سراہا گیا۔روسی دائرۃ المعارف میں مشرق اور مشرقی علوم وآداب پر متعدد مقالات اس مستشرق کے قلم سے نکلے۔بیریزین(Bresine,N.) نے 1896ء میں انتقال کیا۔

****

بلانکو(White Joseph Blanco) کا تعلق برطانیہ سے تھا وہ ایک خالص مستشرق تھا اس لیے کہ اُس نے خود ہسپانیہ جا کر مسلمانوں کی بود و باش کا مطالعہ کیا تھا تا کہ وہ ہسپانیہ کی تاریخ پہ ایک مسبوط کتاب لکھ سکے ۔ وہ ایک پادری تھا اس لیے علم کے باجود مذہبی تعصب سے اپنی جان نہ چھڑا سکا تھا۔ اگر چہ اُس کی سب سے معتبر کتاب وہی ہے جو اُس نے ہسپانیہ کی تاریخ پہ لکھی تھی تاہم اس کے علاوہ بھی اُس کی کئی کتابیں تھیں ۔ بلانکو کا انتقال 1775ء میں ہوا۔

****

ایڈورڈ سخاؤ(Sachau Edward) مشہور و معروف جرمن مستشرق تھا۔

ایڈورڈ سخاؤ ایک بہت بڑا اسکالر تھا اپنے معاشرے میں اُس کا شمار عربی کے اساتذہ میں کیا جاتا تھا۔ اُس نے اپنے کچھ ساتھیوں اور کچھ لائق شاگردوں کو ایک بڑے علمی کام کی طرف مدعو کیا اور اسی کی کوششوں سے طبقات ابن سعد نامی عظیم الشان کتاب کو مرتب کیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ طبقات ابن سعد جیسی کوئی کتاب نہیں جو رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک پہ اس قدر روشنی ڈالتی ہو اور اس قدر تفصیلی ہو۔ ایڈورڈ سخاؤ مشرقی برلن کا رہنے والا تھا۔ وہ برلن یونیورسٹی میں شعبہ زبانیات کا سربراہ تھا۔

****

☚ سلیم نوفل۔(Sleem Nofal) ایک روسی مستشرق تھا۔روسی مستشرقین میں اُس کا مقام بہت بلند تھا۔لوگ اُسے استادوں کا استاد کہا کرتے تھے۔روسی مستشرقین کا سردار سمجھا جاتا تھا۔سیرت النبوی اور اسلامی تعلیمات پر متعدد کتابیں لکھیں۔زیادہ تر کام فرانسیسی زبان میں کیا۔1902ء میں لبنان میں انتقال کیا۔

****

☚ فان کریمر(Von Kremer) بہت قابل مستشرق تھا۔وہ آسٹریا کا رہنے والا تھا۔ویانا میں پیدا ہوا جرمنی میں تعلیم حاصل کی۔پھر اپنے وطن لوٹ آیا سیاست میں حصہ لیا اور وزیر بن گیا۔وہ آسٹریا کا وزیر خارجہ بھی رہا اور دوسری کئی وزارتوں کا قلمدان بھی اُس کے پاس رہا۔سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ اُس کی علمی تشنگی بھی برقرار رہی۔وہ تحقیق و تدوین میں بھی مصروف رہا۔اُس کا میدان مسلمانوں کے قدیم علمی مصادر تھا۔اُس نے قدیم اسلامی مصادر پر تقریباً بیس کتابیں تلاش کیں۔اُن کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا اور اِن علمی مصادر کی طبع اشاعت کا اہتمام کیا۔جو علمی مصادر فان کریمر کے پیش نظر رہے اُن میں واقدی کی المغازی، ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، نشوان کا قصیدہ الحمیر یہ، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اِن کے علاوہ بھی علمی میدان میں اُس نے کئی کارنامے سرانجام دیئے تھے۔اُس نے اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارے میں کثرت سے کتابیں لکھیں۔عام طور پہ اُس کی کتابیں جرمن زبان میں ہیں۔

****

☚ سر ولیم میور(Sir Walliem Mauer) کا تعلق برطانیہ سے تھا۔اُس نے سیرت رسول اللہ ﷺ پہ قلم اٹھایا۔بعض نے اُسے معتدل مستشرق قرار دیا ہے مگر حقیقت میں وہ

ایک پست شخص تھا اس لیے کہ اُس کی مشہور عالم کتاب (The Life of Muhammad) اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اِس کتاب میں جس حد تک کوئی انسان جھوٹا ہوسکتا ہے اسی حد تک اُس نے جھوٹ بولا ہے۔ علامہ سر سید احمد خان نے اُس کی کتاب کا رد لکھا تھا جس میں اُس کے ایک ایک جھوٹ کا پول کھولا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ولیم میور ایک بد بخت شخص تھا۔

****

☚ مینارڈ (Meynard Barbier de) فرانسیسی مستشرق تھا۔ استشراق سے متعلق اُس نے ایک رسالہ شائع کیا جس کا شمار تحریک استشراق کے اولین شماروں میں کیا جاتا ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، ادب اور لغت اُس کے علمی میدان تھے۔ تاہم اُس کا بڑا علمی کارنامہ مسعودی کی ''مروج الذھب'' کا فرانسیسی میں ترجمے کو قرار دیا جاتا ہے۔ مینارڈ کا انتقال 1908ء ہوا۔

****

☚ رینی باسے (Basset rene) کا تعلق فرانس سے تھا۔ وہ بہت صاحب علم اور بہت سی کتابوں کا مصنف تھا ۔ اُس کے علمی کارناموں میں مصنف کا ترجمہ وہ حواشی، الشعرا العربی قبل الاسلام، بوصیری کا قصیدہ بردہ، وغیرہ شامل ہیں۔ رینی باسے نے 1924ء میں انتقال کیا۔

****

☚ ڈاکٹر لیبان (Lebon Dr, G.) کا تعلق فرانس سے تھا۔اُن کا شمار گنتی کے اُن مستشرقین میں کیا جاتا ہے جو انصاف پسند تھے جن کا دامن جھوٹ سے آلودہ نہ تھا جو سچے مورخ تھے اور جنھوں نے علم کو بغیر کسی نسلی و مذہبی تعصب کے اگلی نسلوں تک منتقل کیا تھا۔ڈاکٹر لیبان نے متعدد ضخیم کتابیں لکھیں جن کو علم کی دنیا میں بلند مقام حاصل ہوا۔تمدن مصر، تمدن عرب، تمدن ہند، اور اندلس میں عربی تمدن پر قابل ذکر کتابیں لکھیں۔

****

☚ گولڈزیہر (Goldziher, V.) ہنگری کا رہنے والا تھا۔کثیر التصانیف شخص کہلاتا تھا۔قرآن، تفسیر، حدیث اور سیرت نبوی پہ بے شمار کام کیا بہت سی کتابیں لکھیں۔بے شمار اور کمال کی حدوں کو چھوتے مقالات لکھے۔وہ پہلا مستشرق ہے جس نے حدیث پاک کے بارے میں اشتباہ پیدا کیا اور انکار حدیث کے فتنے کی بنیاد رکھی۔اُس کی موت کے بعد دوسرے کئی مستشرقین نے انکار حدیث کے تصور کو آگے بڑھایا۔گولڈ ریہرز نے سیرت کے دوسرے مصادر کو بھی نشانہ بنایا۔1921ء میں اُس بد بخت کا انتقال ہو گیا۔

****

☚ ولہازن (Wellhausen,J.) کا تعلق جرمنی سے تھا۔اُس نے اپنے پیچھے بہت سی کتابیں چھوڑیں جو اُن کی یادگاریں تصور کی جاتی ہیں۔اُس نے بہت مختلف اور متنوع موزوعات پہ کام کیا۔جن میں تاریخ یہود، محمد رسول اللہ ﷺ مدینہ میں، دین اسلام کے مطالعات، عہد نبوی میں دستور مدینہ، مکاتیب نبوی اور وفود عرب شامل ہیں۔ابن سعد سے منقول مرویات کا ترجمہ اور حواشی بھی اُس کے علمی کام میں شامل ہیں۔وہ پروٹسٹنٹ تھیوموجین

اور بائبل پر بھی عبور رکھتا تھا۔ دلہازن کا انتقال 1918ء میں ہوا۔

****

☚ واشنگٹن ارونگ (Irving Washington) معروف امریکی سکالر اور مستشرق تھا۔ اُس نے بہت سی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت پہ حیات محمد نامی کتاب لکھی۔ خلفاء پر ایک تحقیقی کتاب لکھی جو دو جلدوں پہ مشتمل تھی۔ معتدل مستشرق تھا اس لیے اُس کی کتاب حیات محمد کا عربی زبان میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ واشنگٹن ارونگ نے 1859ء میں انتقال کیا۔

****

☚ یوجین یونج (Eugens Yourng) فرانسیسی مستشرق تھا۔ متعدد علمی موضوعات پہ قلم اٹھایا اور کئی یادگار کتابیں لکھیں۔ یوجین کو معتدل خیال کیا جاتا ہے۔ ایک ضخیم رسالہ "نور اسلام کی خاص کرن" لکھا اس کے بعد ایک اور رسالہ لکھا جس کا نام "مشرق جس طرح مغرب نے اُسے دیکھا" تھا۔ فرانسیسی زبان میں رسول اللہ ﷺ سیرت پہ بھی کتاب لکھی۔



تحریک استشراق بیسویں صدی میں

بیسویں صدی کو تحریک استشراق کا عہد جدید قرار دیا جاتا ہے۔عہد جدید اپنے جلو میں نت نئے رجحانات لے کر آیا اور سیاسی وعسکری، معاشی ومعاشرتی، تہذیبی وثقافتی سطح پر پچھلی بہت سی باتوں کو زیروزبر کر گیا۔چنانچہ عالمی جنگیں اور اس کے نتیجے میں مشرقی ومغربی معاشروں پر ہمہ گیر اثرات، نو آبادیاتی علاقوں کی بیداری ،ظلم واستحصال کی تاریکیوں کے خلاف حریت وآزادی کی روشنی استعماری قوتوں کا زوال، ایجادات واختراعات کا ظہور، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظریات کی نمو اور تہذیب وتمدن کے تنوع نے حالات ومسائل کی نوعیت کو بہت کچھ بدل ڈالا۔اُدھر مستشرقین نے بھی خود کو بدل ڈالا تھا اور جدید حالات کے تحت وقت کے بدلتے ہوئے دھارے سے ہم آہنگ رہنے کے اقدامات کر لیے تھے۔تحریک استشراق نے اپنی بوسیدہ روایات کو ترک کر دیا تھا کہ اب ایک علمی دور تھا چنانچہ انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق زیادہ انہماک اور توجہ سے مطالعہ کا ذوق

اپنا لیا تھا۔ جز وقتی اسکالرز کی جگہ اب اُن کے اداروں میں کل وقتی اسکالرز کام کرنے لگے تھے تا کہ اُن کی تحقیق و جستجو عالمی سطح پر مذاق بن کے نہ رہ جائے۔ اُن کے بڑے اداروں جیسا کہ آکسفورڈ، کیمبرج، لندن اور مغرب کی دوسری جامعات میں قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور دوسرے اسلامی ،مشرقی مباحث کے لیے باقاعدہ نشستیں مخصوص کی جانے لگیں ۔ یہ مطالعہ، یہ انہماک اور یہ جہد و سعی کسی نیک مقصد کے لیے ہرگز نہ تھی ۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ مستشرقین اب جانتے تھے کہ یہ دور قصے کہانیوں اور خرافات کا دور نہیں ۔ اس لیے انھوں نے ٹھوس مطالعہ اور گہری تحقیق کے ذریعے اسلام کی بیخ کنی کرنے کی ٹھانی ۔ مستشرقین نے اب کے مسلمانوں کے ماخذ سے ہی فائدہ اٹھایا۔ اس تحرک نے بعض اوقات یہ معجزہ بھی دکھایا کہ کوئی مستشرق بد نیتی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی طرف راغب ہوا مگر اللہ تعالیٰ نے اُسے ہدایت کے لیے چن لیا۔ بہت سے مستشرقین ایسے تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اُن کا احوال اپنی جگہ پہ آئے گا۔

مستشرقین کے اس عہدِ جدید میں مطالعہ سیرت کے حوالے سے کسی حد تک اعتدال پسندی کی روایت نے جنم لیا۔ جسے ویل، گوئٹے اور کارلائل وغیرہ نے آگے بڑھایا۔ اس عہد میں الفانسو، آرچر، تائن بی، بلاشیر اور منٹگمری واٹ وغیرہ کے یہاں انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ معقولیت و معدلت کے بعض نمونے بھی نظر آتے رہے۔ اسلامی مصادر کی تحقیق و دریافت، اُن کی تبویب اور شاریہ سازی کا کام نہ صرف آگے بڑھا بلکہ مستشرقین نے اس ضمن میں اپنی اجارہ داری قائم کر دی کیونکہ وہ وسائل سے لیس اور علمی روایت سے بھر پور تھے تو دوسری طرف امت مسلمہ ابھی تک اُن زخموں کو چاٹ رہی تھی جو اُسے دورِ استعمار میں لگے تھے اس لیے فی الحال اُس کے پاس علمی تحقیق کے لیے نہ تو وقت تھا اور نہ وسائل اس لیے اہلِ مغرب کے مستشرقین ہی تھے جو نیت بد سے ہی سہی اسلامی مصادر کی طرف بہر حال متوجہ تو تھے۔

انھوں نے اسلامی مصادر کے ساتھ ساتھ مشرقی مصادر پر بھی جرح و نقد کے کام کو وسیع پیمانے پر سر انجام دیا۔ یہ غالباً تحریک استشراق کے مزاج سے بھی ہم آہنگ تھا کہ مآخذ و مصادر سے اعتماد اسی صورت میں متزلزل کیا جا سکتا ہے کہ اُس میں تشکک اور تذبذب کا بیج بو دیا جائے ۔ اس ضمن میں

خاص طور پہ قرآن وسنت کونشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں مستشرکین کی وہ جماعت سامنے آئی جو لعن طعن پہ تو نہ اترتی مگر مہذب زبان میں اُن کا نقطہ نظر اتنا ہی پست تھا جتنا کہ اُن لوگوں کا نقطہ نظر جو براہ راست گالی دینے سے باز نہ آتے تھے۔ مثال کے طور پہ دیکھیں کہ اِس گروہ میں سے ایک مستشرق نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ بہت بڑے سیاسی رہنما تھے اور اپنی کامیاب سیاسی چالوں کی وجہ سے جلد ہی سارے عرب پہ قابض ہو گئے۔ تو بظاہر یہ مستشرق رسول اللہ ﷺ کی سیاسی بصیرت کی تعریف کرتا نظر آتا ہے مگر بہ باطن وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کے رسول نہ تھے بلکہ ایک سیاست دان تھے۔

اسی طرح کچھ مستشرقین کہتے کہ رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) بیمار تھے اور انھیں مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ ہنری لانس اور برطانوی مستشرق اسپرنگر کا یہی خیال تھا۔ حالات کے دھارے کے ساتھ اپنی شکل اور اہداف بدلتی تحریک استشراق نے کبھی اور کسی بھی دور میں اپنے بنیادی ہدف اسلام اور پیغمبر اسلام کی ہجو کو نظر انداز نہ کیا۔ چنانچہ عہد جدید میں جن نئے رجحانات اور نئی تحریکوں نے جنم لیا اُن میں اشترا کی نقطہ نظر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مارکس اور اینجلز کے خیالات اور تاریخ کی مادی تعبیر نے اپنا حلقہ اثر پیدا کیا اور ایسے مستشرقین آگے آئے جن کی نظر میں اسلام کی اشاعت وفروغ اور پیغمبر اسلام کی کامیابیاں دراصل سیاسی ،سماجی اور معاشی عوامل کی کارفرمائیوں کا نتیجہ تھیں۔ اس ضمن میں جرمن مستشرق ہیوبرٹ کرائم (Hubert Crimme) کا نام معاشی نظریہ ارتقاء کی علامت بنا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام پر کرائم کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ (Hubert Crime) کی تحریروں سے با آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کو ایک مذہبی اور دینی نظام کی بجائے ایک بہتر سماجی نظام اشترا کیت سمجھتا تھا۔

دراصل وہ کہنا چاہتا ہے کہ آنخضرت محمد ﷺ (معاذ اللہ) اللہ کے رسول نہ تھے بلکہ اپنی قوم کے سیاسی و سماجی و معاشی مصلح تھے۔ سیاسی ،سماجی اور معاشی نقطہ ہائے نظر کا رنگ مارگولیتھ (Margoaiouth) نے مزید گہرا کیا۔ کرائم کی طرح مارگولیتھ بھی آنحضرت محمد ﷺ کو اللہ کے رسول کی بجائے سیاسی رہنما ہی قرار دیتا ہے۔ مارگولیتھ نے اپنی کتابوں اور مقالات میں یہاں تک

لکھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں اپنی ''دوکان'' سے اٹھ کر مدینہ کی حکمرانی بہت ہی کم عرصے میں حاصل کر لی اور محض 23 سال میں ایک مملکت (مدینہ) کے حکمران بن بیٹھے۔ مستشرقین میں سے مار گولیتھ نے دریدہ ذہنی کی انتہا ہی کر دی اور آنحضرت محمد ﷺ کو ڈاکوؤں اور ظالموں کا سردار تک لکھ ڈالا۔ اطالوی مستشرق پرنس لیون کتان نے اپنے دیو پیکر کام کا ما حصل یہ قرار دیا کہ آنحضرت محمد ﷺ ایک طاقتور اور چالاک سیاست دان ثابت ہوئے تھے۔ انھوں نے مدینہ کی ریاست حاصل کی اور مکہ پر طاقت کے زور سے قبضہ حاصل کر کے تمام عربوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیا۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے مستشرقین رسول اللہ ﷺ کو ایک مفاد پرست سیاسی رہنما قرار دینے پر بضد تھے۔ مطالعہ سیرت میں یہ انتہا پسندی چونکہ خلاف حقیقت تھی اس لیے مستشرقین کی اکثریت میں بھی اس تخیل کو پسند نہ کیا گیا۔

بعض مستشرقین اس انتہا پر نہ گئے اور بین بین رویہ اختیار کیا۔ مثال کے طور پر دیکھیں کہ عہد جدید کا مشہور مورخ ٹائین بی اپنی عظیم الشان تصنیف **''مطالعہ تاریخ''** میں دنیا جہان کی تہذیبوں کا مطالعہ کرتا ہے اور واقعات سے اصولوں کو اخذ کرتا ہے۔ پھر اسلام کے بارے میں بھی عمومی طور پر معقول رویہ اختیار کرتا ہے۔ لیکن جب سیرت رسول ﷺ پر قلم اٹھاتا ہے تو آپ ﷺ کی حیات طیبہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک نبی اکرم ﷺ جب تک مکہ میں رہے تو مشنری سرگرمیوں میں منہمک رہے اور جب مدینہ پہنچے تو سیاسی سرگرمیوں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ ٹائن بی کے تخیل کو اگر مختصراً بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے نزدیک آنحضرت محمد ﷺ کی بجائے مسیح علیہ السلام ہی ایک مثالی پیغمبر ہیں۔ عہد جدید کے ایک اور مستشرق بلاشیر (Blachere) اپنی کتاب "le.Proleme de" Mohomet میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے بیان میں سیرت پاک سے زیادہ سیرت پاک کے مصادر سے بحث کرتا ہے اور غلو سے بچتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ احادیث و سیر کے ذخیرے میں ایک حصہ بہر حال ایسا ہے جسے جدید تکنیکی طریقوں سے جانچ پرکھ کر مستند قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی قسم کا نقطہ نظر منٹگمری واٹ کا بھی ہے۔ مطالعہ سیرت کے ضمن میں واٹ نے متعدد کتابیں لکھیں۔ واٹ کی تصنیفات کو بہر حال آخری جدید ترین

کوششوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔اُس کے نزدیک مصادر نے جہاں تک اجازت دی اپنی دانست میں اُس نے مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔منٹگمری واٹ کے کام کی خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال کے دوران ''علمیت'' نے جو ترقی کی ہے اُس کا مظاہرہ اُس کی تصنیفات میں نظر آتا ہے اس کی تصانیف اسلامی مآخذ کی جدید ترین دریافت اور جرح وتنقید کے اصولوں کی عکاسی کرتی ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ واٹ کا موقف ٹائن بی سے زیادہ مختلف نہیں ہے کہ وہ بھی آنحضرت محمد ﷺ کی شخصیت کو مکہ اور مدینہ میں مختلف بیان کرتا ہے۔

بہرحال عہد جدید کا یہ عمومی جائزہ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ عہد جدید کے مستشرقین اگرچہ اپنے اندازِ تحریر، اپنی علمیت اور طرز ہائے تحقیق میں اپنے اسلاف سے بہت مختلف ہوگئے اور بہت سے معاملات میں انھوں نے بالکلیہ رجوع کرلیا تاہم یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تمام تر جدیدیت کے علی الرغم تحریک استشراق اصل محرک جذبہ اب بھی کارفرما کی حیثیت رکھتا ہے۔ظاہر ہے کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام سے بغض وحسد ہی ہے۔چنانچہ عہد جدید کا مستشرق اپنی زبان وقلم سے اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور نظر آتا ہے کہ پرانی دشمنی عہد جدید میں بھی جاری وساری ہے۔علاوہ ازیں اس صورتِ حال میں ایک اور جدید مستشرق ''ایڈورڈ ڈبلیو سعید'' کا تجزیہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ تحریک استشراق (Orientalism) اور اس تحریک کا اہتمام وانظباط بنیادی طور پر اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ایک سیاسی ضرورت کے تحت ہوا اور استشراق کو جہانِ مشرق پر اس وقت مسلط کیا گیا جبکہ مشرق مغرب کے مقابلہ میں مغلوب ومنفعل تھا اور پھر قوت وضعف کے اسی تفاوت نے بعض لازمی نتائج کو پیدا کیا۔

استشراق کے درحقیقت دو چہرے ہیں، دو رخ ہیں۔ایک داخلی اور پوشیدہ پہلو (Latent) اور دوسرا ظاہری خارجی رخ (Manifest)۔داخلی پہلو (Latent Orientalism) یعنی پوشیدہ رخ تو ہمیشہ سے ایک ہی ہے جسے کبھی کسی زمانہ میں نہیں چھوا گیا۔جبکہ دوسرا ظاہری پہلو (Manifest Orientalism) متغیر ہوتا رہا۔یعنی مشرقی معاشرہ وتہذیب زبان وادب، تاریخ، معاشرت وغیرہ کے بارے میں خیالات وافکار بدلتے رہے۔مختصر یہ کہ مستشرقین کے

خیالات میں تبدیلی اسی ظاہری استشراق کے حوالہ سے آتی رہی۔لیکن داخلی جذبہ واستشراق ہمیشہ سے لے کر آج تک یکساں محکم و مستحکم رہا اور کسی واضح تبدیلی سے آشنا نہیں ہوا۔بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ استشراق کسی مثبت اور تعمیری رویہ وسلوک ودستور(Positive Doctrine) کا نام نہیں، بلکہ یہ مغرب کی جاری کردہ موثر علمی روایت ہے۔ذیل میں ہم عہد جدید کے چند مشاہیر کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں۔

****

☚ ہیگاڈفرے ڈی ممبائن (Goudefroy Demombynes) اس نے کئی کتابیں تحریر کیں۔فرانس میں وہ مشرقی علوم السنہ کے شعبہ میں عربی کا استاد تھا۔اُس کی یادگار تصانیف میں نظم اسلام، مکہ و مدینہ، عالمی اسلام اور بازنطینی صلیبیوں تک وغیرہ شامل ہیں۔ مونٹے (Montet,Ed) کا انتقال 1957ء میں ہوا۔

****

☚ مونٹے (Montet,Ed) فرانسیسی مستشرق بھی فرانس کا رہنے والا تھا۔اُس نے متعدد کتابیں لکھیں جن کا تعلق اسلام یا علوم مشرقیہ سے تھا۔اُس نے قرآن حکیم کا ترجمہ بھی کیا تھا اور تاریخ اسلام پر بھی ایک مسبوط کتاب تحریر کی تھی۔اُس کا انتقال 1927ء میں ہوا۔

****

☚ کارلوالفانسونل لینو(Carlo Alfanso) ایک اطالوی مستشرق تھا۔الفانسو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے بے شمار کتابیں تحریر کیں۔سب کا نام لکھنا طوالت کا باعث ہوگا اس لیے ہم اُس کی چند مشہور کتابوں کے نام تحریر کر دیتے ہیں۔اُس کی مشہور کتابوں میں، قبل از اسلام قبائل عرب کی تکوین وترتیب، تاریخ یمن قبل از اسلام، ممالک عرب کی تاریخ، اسماء الرجال پہ تحقیق، قبائل وتراجم رجال، فہرست مخطوطات، روایت اور مصادر کی تحلیل شامل ہیں ۔الفانسو نے آنحضرت محمد ﷺ کی سیرت پاک بھی تحریر کی جو اُس کی وفات کے بعد 1949ء میں روم سے شائع ہوئی۔الفانسو 1938ء میں انتقال کر گیا تھا۔

****

☚ سر تھامس آرنلڈ(Arnold Thomas) انگریز تھا اور انگلستان کا شہری تھا۔ اُس کی مشہور ترین کتاب(The preching Islam)ہے جو لندن سے 1896ء میں شائع ہوئی۔انگلستان کی گورنمنٹ نے تھامس کی علمی خدمات کی وجہ سے انھیں سر کا خطاب دیا۔سر تھامس آرنلڈ کا انتقال 1930ء میں ہوا۔

****

☚ رابرٹ بریفالٹ(Briffault Robert)ایک برطانوی مستشرق تھا۔دراصل تو وہ ایک سرجن ڈاکٹر تھا تاہم دیگر علوم میں بھی اس کی دلچسپی بے پناہ تھی۔وہ ایک ناول نگار بھی تھا اُس نے کئی کتابیں لکھیں ۔ اس ہمہ پہلو شخصیت کا انتقال 1926ء میں ہوا۔ (Briffault Robert)کی مشہور ترین کتاب "The Making of

"Humanty" تھی۔ جولندن سے شائع ہوئی۔

****

☚ مارماڈیوک پکتھال (Picthall M.W)ایک مشہور علمی شخصیت تھی جس کا تعلق برطانیہ سے تھا۔وہ بھی ایک مستشرق تھا۔وہ اسلامی اور مشرقی علوم کا ماہر مانا جاتا تھا۔اسلامی تہذیب وتمدن پر اُس کے بعض خطبات یادگار کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔اُس نے قرآن حکیم کا ترجمہ بھی کیا تھا۔مارک نے 1936ء میں انتقال کیا تھا۔

****

☚ اسٹینلے لین پول(Stanlay lane poole) کا تعلق برطانیہ سے تھا۔وہ ایک ہمہ جہت شخصیت تھی۔وہ مورخ تھا، ماہر آثاریات تھا،اندلس کی تاریخ پہ اُس کی گہری نگاہ تھی،اس کے علاوہ وہ قدیم سکوں اور تحریروں کی جانچ پرکھ کا بھی ماہر تھا۔وہ برٹش میوزم میں پرانے سکوں کی حفاظت پر متعین تھا۔اُس کا خاص کارنامہ مسلمانانِ اندلس کی تاریخ تحریر کرنا تھا ۔اسٹینلے لین پول نے 1945ء میں انتقال کیا۔

****

☚ نکلسن(Nicholoison R.A.) بھی مشہور برطانوی مستشرق تھا۔اُس کی متعدد کتابوں کا پتہ چلا ہے۔اُس کی خاص خاص کتابوں میں عربی ادب کی تاریخ،محمد اور قرآن

شامل ہیں۔ بیان کیا گیا کہ اُس نے آنحضرت محمد ﷺ کی سیرت پاک پہ بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ نکلسن کا انتقال 1945ء میں نیویارک میں ہوا۔

****

☚ نولیدیکے (Noldeke,th.) کا تعلق جرمنی سے تھا۔ تاریخ اسلام اور سامی مذاہب پر کئی کتابیں تحریر کیں۔ نیز اُس نے قرآن حکیم کی سورتوں کی ترتیب پر بھی قلم اٹھایا۔ اُسے نقد حدیث کا امام بھی کہا جاتا ہے کہ کیونکہ سب سے پہلے اُسی نے روایوں کی جانچ پرکھ کا تصور پیش کیا تھا۔ سیرت پر اُس کی دو کتابیں بے حد مقبول ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

Das Hasben Muhammad, s nach der

Quellen popular largestelt

نویدیکے نے 1938ء میں وفات پائی۔

****

☚ ہرگرونج (Snouck Hergronje, C) ہالینڈ کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک کٹر عیسائی تھا اُس نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر ولندیزی زبان میں تھیں۔ وہ اسلامی علوم کا ماہر جانا جاتا تھا۔ وہ اسلام کو سیاسی مذہب قرار دیتا تھا۔ ہرگرونج کا تعلق بھی مستشرقین کے اُس گروہ سے تھا جو اسلام کے بارے میں جانے بغیر اسلام پر بڑی بڑی کتابیں لکھتے رہتے اور اپنی جہالت سے اپنی قوم کو حق سے دور لے جانے کا فریضہ ادا کرتے۔ اُس نے

فقہ اسلامی اور سیاست نبوی کے بارے میں کتابیں لکھیں ۔ یہ جاننا مشکل نہیں کہ اُس نے کیا لکھا ہوگا۔ ہرگرونج کہتا ہے کہ ایک نجی اسلام ہے اور ایک سرکاری اسلام ہے۔اس بیان سے اُس کے علم کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ 1938ء میں یہ بدبخت انتقال کر گیا۔

****

☚ ونسنک (Wensinck,A.J.) اطالوی مستشرق تھا۔کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ اُس کی تحریروں میں جس کتاب نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ دراصل اُس کا مقالہ تھا جو اُس نے PHD کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے لکھا تھا۔اُس کے مقالے کا موضوع تھا ''یہود مدینہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا موقف'' اُس کا یہ مقالہ 1908ء میں لیڈن سے شائع ہوا۔اُس کی ایک اور کتاب ''محمد (ﷺ) اور یہود 1911ء میں شائع ہوئی۔ 1939ء میں اُس کا انتقال ہو گیا۔

****

☚ زاخاؤ (Sachau. E.) جرمنی کا رہنے والا تھا۔علمی مزاج کے حامل اس شخص کی ساری زندگی علمی سرگرمیوں میں صرف ہوئی ۔ مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ یہ زاخاؤ ہی کوششیں تھیں جن کی بدولت طبقات ابن سعد جیسی بڑی کتاب مسلمانوں تک پہنچی۔اُس نے جگہ جگہ سے مسلمانوں کی اس انمول کتاب کو جمع کیا اور زیور طبع سے آراستہ کیا۔زاخاؤ کا انتقال 1930ء میں ہوا تھا۔

****

☚ جوزف ہورووز (Horovitz,J) جرمنی کا رہنے والا تھا۔اپنے PHD کے مقالے کے لیے اُس نے مغازی واقدی پر قلم اٹھایا اور ایک زبردست مقالہ تحریر کیا۔ بعد میں یہی مقالہ کتابی شکل میں 1898ء میں شائع ہوا۔یہی کتاب جوزف کی وجہ شہرت بنی۔ اس کتاب کو کئی بار شائع کیا گیا۔جوزف کا انتقال 1931ء میں ہوا۔

****

☚ جوزف ہیل (Hell , Joseph) بھی ایک جرمن مستشرق تھا۔اسلامی علوم کا ماہر مانا جاتا تھا۔اُس کی ساری کتابوں کا سراغ نہیں ملا۔اگرچہ اُس کی ساری کتابیں اب موجود نہیں تاہم جو موجود ہیں وہ جوزف ہیل کی علمیت ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔عربوں کی قدیم روایات اور تہذیب وتمدن پر اُس کی کئی کتابیں اب تک موجود ہیں جو اُس کے علم کی غماز ہیں جوزف ہیل کا انتقال 1950ء میں ہوا۔

****

☚ کارل بروکلمان (Brockeimman.C) بھی جرمنی کا رہنے والا تھا۔کہا جاتا ہے کہ اُس نے بے شمار کتابیں لکھی تھیں۔اُس کی ساری کتابیں اب دستیاب نہیں تاہم کئی کتابیں اب بھی موجود ہیں۔اُس کی مشہور ترین تصنیف "تاریخ اقوام مسلم" ہے۔بیان کیا گیا کہ کارل نے آنحضرت محمد ﷺ کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جو وقت کی راکھ میں کہیں دب گئی۔کارل بروکلمان کا انتقال 1956ء میں ہوا۔

****

☚ بارتھولڈ(Barthold,V.V.) روس کا رہنے والا تھا۔اُس کی تصانیف کثرت سے ہیں ۔اسلامی تہذیب،تاریخ ترکستان، عالم اسلام،خلفائے راشدین ،حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اُس کی مقبول کتابوں میں شامل کی جاتی ہیں۔ بارتھولڈ کی بہت سی کتابیں اب دستیاب نہیں،بارتھولڈ کا انتقال 1930ء میں ہوا۔

****

☚ صیمول زویمر(Zewemer S) امریکہ کا رہنے والا تھا۔وہ بہت سی کتابوں کا مصنف تھا اس لیے اُسے امریکی مستشرقین کا سرخیل بھی قرار دیا جاتا ہے۔اُس نے اسلام اور مسیحیت کے مابین تعلقات پر کئی کتابیں تحریر کیں۔اُس کی مشہور کتابوں میں بلادِ عرب، دنیا میں اسلام، حیاتِ محمد ، اسلام صحرائے عرب میں اور ورثہ نبی شامل ہیں۔صیمول زویمر نے 1944ء میں انتقال کیا۔

****

☚ اچ، جی ویلز(Wells,Herbert,gorge) برطانوی مستشرق تھا وہ ہمہ جہت شخصیت تھا،وہ افسانہ نگار بھی تھا،مورخ بھی تھا،ماہر عمرانیات بھی تھا،علاوہ ازیں وہ مشرقی اور اسلامی امور کا بھی ماہر تھا،اُس نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں ، خاص طور پر اُس کی

کتاب Out line of History.& Mohammad and Islam.
شامل ہیں۔ویلز کا انتقال 1946ء میں ہوا۔

****

☚ گب ہملٹن (Gibb Sir Hamiliton A.R.) عہد جدید کا مقبول ترین مستشرق تھا۔اُسے برطانوی مستشرقین کا بزرگ بھی تصور کیا جاتا ہے۔گب کی تصنیفات بہت سی ہیں مگر اُس کی وجہ مقبولیت "Mohammadenism" نامی کتاب بنی۔کتاب کا نام مسلمانوں میں ناپسندیدہ خیال کیا جاتا ہے۔گب نے اگرچہ اس ضمن میں کئی تعویلات پیش کی ہیں مگر انھیں قبول نہیں کیا جا سکتا۔خود گب کے شاگرد خاص اسمتھ نے اس کتاب کے نام اور کتاب کے کئی مندرجات پر شدید تنقید کی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے گب ساری زندگی اسلام کے بارے میں تذبذب کا شکار رہا۔اُس کے علمی ارتقاء سے اس بات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گب کے نظریات بدلتے رہے۔آخیر زمانے میں تو گب نے اسلام کے بارے میں بہت نرم رویہ اختیار کر لیا تھا۔ابھی چند سال پہلے ہی گب کا انتقال ہوا۔

****

☚ ولفریڈ کینٹول اسمتھ (Simith, W.C) گب کا شاگرد تھا،1916ء میں برطانیہ میں پیدا ہوا۔1949ء میں اُس نے PHD کی۔ولفریڈ نے مشہور مورخ اور مستشرق فلپ کے حطی سے بھی رہنمائی لی۔اور اسی کے زیر نگرانی اپنا PHD کا مقالہ تحریر کیا۔اُس کے

مقالے کا عنوان ''مجلۃ الازہر تجزیہ وتنقید'' تھا۔ مذہباًوہ کٹر عیسائی تھا۔ اُس نے بہت سی کتابیں تحریر کی تھیں آخری اطلاع کے مطابق ڈلہوزی یونیورسٹی کینیڈا میں مشرقی علوم کا سربراہ تھا۔

****

☛ جوزف شاخت (Schacht,J) جرمن مستشرق ہے۔ 1902ء میں پیدا ہوا۔ یہودی النسل ہے۔ اسلام اور اسلامی علوم پر متعدد کتابیں لکھیں۔ تاہم اُس کا اصل کام وہ ہے جو اُس نے اسلامی قانون اور اصول فقہ اسلامی پر کیا۔ اُس کی موت کی ہمارے پاس کوئی خبر نہیں۔

****

☛ برنارڈ لوئیس (Levis, Berrnard) عہد جدید کا مشہور برطانوی مستشرق ہے۔ 1916ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ برنارڈ بہت سی کتابوں کا مصنف ہے۔ اُس کی مشہور کتابوں میں "Arabs in Historty" اور "Islam in History" شامل ہیں۔ برنارڈ کا تعلق بھی اُس بدبخت قبیلے سے ہے جو اسلام دشمنی میں حد سے گزر گیا اور جن کے سینے آنحضرت محمد ﷺ کی عظمت ورفعت سے ہمیشہ جلن محسوس کرتے رہے۔ برنارڈ لیوس یہودیوں کا نمک خوار ہے اور ظاہر ہے جو یہودیوں کا نمک خوار ہوگا اُس کی زبان وقلم سے مناسب بات نکلنی ممکن نہیں۔ برنارڈ لیوس کیمبرج ہسٹری آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مدیر و مقالہ نگار بھی ہے۔ آج کے عہد میں زندہ وموجود مستشرقین میں سے جو لوگ اسلام دشمنی میں سر

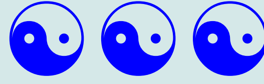
فہرست دکھائی دیتے ہیں اُن میں برنارڈ لوئیس کو آسانی سے شامل کیا جا سکتا ہے۔

****

عہد جدید کے مشاہیر مستشرقین کا مندرجہ بالا تعارف اگرچہ مختصر ہے لیکن تحریک استشراق کے کیف و کم کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے۔ بطور خاص ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحریک استشراق اپنے آغاز اور عروج وارتقاء کی منزلیں طے کرنے کے بعد آج کے عہد میں انتشار (Crisis) سے دوچار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مصنفین اپنی اصل تحریک کو اب بھی سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن رویہ اور سلوک کی وہ یکسانیت بہرحال نظر نہیں آتی جو پہلے اُن کا خاصا تھی۔ مستشرقین کی نوجوان نسل زمانے کے حالات و مسائل کے پیش نظر ذہن وفکر کی نئی تبدیلیوں سے دوچار ہو رہی ہے۔ اِدھر اسلامی دنیا میں بھی سوچ کی نئی لہریں پیدا ہو رہی ہیں، سیاسی و ادبی ہر دو سطح پر ہلچل موجود ہے۔ خاص طور پہ سیاسی محاذ پر مسلمانوں کی بیداری تو عروج کو پہنچتی دکھائی دیتی ہے۔ مصر میں انقلاب آ چکا ہے ایران میں بھی اسلامی انقلاب آ چکا ہے، اردن، یمن اور تیونس سے بھی آمرانہ حکومتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اِن ممالک میں ایک نئے جمہوری عہد کی نوید سنائی دے رہی ہے۔

شام میں اس انقلاب کی بنا پڑ چکی ہے اور عوام سیاسی آزادی کے لیے اپنا خون شام کی سڑکوں پر بہا رہی ہیں منزل انشاءاللہ بہت قریب ہے۔ اسی طرح علم و ادب کی ایک نئی لہر بھی موجود ہے اور بعض جدید مفکرین و مصنفین مشرق کی تحریروں نے خود مغربی دنیا میں مد و جزر پیدا کر دیا ہے۔ پھر یہ بات بھی صاف ہے کہ اب طاقت و قوت کے سارے اوزان اور پیمانے بدل گئے ہیں ۔ استعمار اور استحصال کی لغات منقلب ہو گئی ہیں۔ علمی و ذہنی مرعوبیت کا عالم بھی پہلے جیسا نہیں رہا اور اب مشرق بھی آنکھیں کھول کر فلک فضاء اور زمین کو دیکھ رہا ہے۔ اس لیے کیا عجب کہ آنے والا زمانہ تحریک استشراق کے کوچ کا بگل بجا دے۔ اس لیے بقول ایک مصنف وقت آ گیا ہے کہ اسلامی مفکرین و علماء اپنے حریفوں کے مدمقابل آئیں اور معاندین و مخالفین اسلام کے خلاف علمی محاذ پر حقیقی معرکہ کے لیے صف آراء ہو جائیں۔ البتہ معروضیت (Objectivity) کا خواہ مخواہ دعویٰ نہ کریں کہ

علمی معروضیت تو درحقیقت محض فریب نظر (Myth) ہے۔



تحریک استشراق ایک بڑی تحریک ہے تو لا محالہ اس کا مطالعہ بھی بہت وسعت اختیار کئے ہوئے ہے ہم نے اختصار کی راہ اختیار کی ہے جس کی وجہ سے اس کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنا ممکن نہیں اب ہم مختصراً تاریخ کی روشنی میں اس تحریک کے پس پردہ عوامل کا جائزہ لیں گے۔

تحریک استشراق، پس پردہ عوامل

تحریک استشراق نے اپنے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک کا سفر جس انداز میں طے کیا ہے اُس کا عمومی جائزہ اگرچہ گذشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے اور بین السطور تحریک کے اغراض و مقاصد اور محرکات کی بھی بڑی حد تک نشاندہی ہو چکی ہے تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک استشراق کے پس پردہ عوامل پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا کہ اسلام اور ادیانِ غیر میں بڑے اور بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اسلام کا نظریہ حیات، اس کا نظام فکر و عمل، اس کے تہذیب وتمدن کا اظہار، یہودیت عیسائیت اور دوسرے مشرکانہ مذاہب سے یکسر مختلف ہے۔ پھر دانائے سبل ختم الرسل ﷺ نے اسلام کی جو دعوت پیش کی اُس نے روز اول سے ہی ادیانِ باطلہ کی نفی کر دی تھی۔ اس لحاظ سے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دوسرے مذاہب کے علمبردار، اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام

کے بارے میں سخت معاندانہ جذبات رکھتے ہیں اور اپنے بغض وعناد کا اظہار ہر ممکن طریقے سے کرتے ہیں۔ اُن کا یہ رویہ اور اُن کی شقاوت وقساوت دراصل نظریاتی اور فکری بنیادوں پر استوار ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک جگہ اس حقیقت کبریٰ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ؛

"اھل ایمان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ھیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ھیں کہ ھم نصاریٰ ھیں یہ اس لیے کہ اِن میں عالم بھی ھیں اور مشائخ بھی اور ان میں اللہ سے ڈرنے والے بھی ھیں جو تکبر نہیں کرتے"۔

****

جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے اُن کے پورے گروہ میں نمایاں تر یہود ہیں نصاریٰ ہیں اور مشرک ہیں انھیں اسلام اور اہل اسلام اور عالم اسلام کی سرفرازی کسی طور پسند نہیں۔ بلکہ وہ اِن کو ہر آن زِک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے تحریک استشراق کی اٹھان اسلام دشمنی کے زیر سایا ہوئی اور مستشرقین کی مساعی کا ہدف یہ ٹھہرا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو دنیا کے سامنے کریہہ المنظر بنا کر پیش کیا جائے۔ نظریاتی سبب کے علاوہ ایک تاریخی سبب بھی نظریہ استشراک کا باعث بنا کہ آنحضرت محمد ﷺ کا لایا ہوا انقلاب آن کی آن میں پھیلتا چلا گیا اور اس کے علمبرداروں نے انتہائی مختصر مدت میں اسلام کا پرچم دنیا کے دور دراز علاقوں تک جا لہرایا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنی پیش قدمی میں اسلام نے اپنی راہ کی تمام مزاحمتوں کو اس آسانی کے ساتھ ختم کر دیا کہ دنیا مغرب آج تک انگشت بہ دندان ہے۔ خاص طور پر انھوں نے اُس وقت کی معلوم دنیا کی دو بڑی معلوم طاقتوں روم وفارس کا سر یوں سرنگوں کیا کہ وہ صدیوں خمیدہ رہا۔ بہر حال اسلام کی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ وسعت واشاعت

نے جہاں ایک طرف دنیائے مغرب کی مذہبی ونظریاتی رفعتوں کو پامال کیا وہاں دوسری طرف اسلام کی عسکری فتوحات نے اُن کی شوکت وسطوت کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔ بازنطینی سلطنت کے زرخیز خطوں شام وفلسطین ومصر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور چرچ کے مضبوط قلعے فتح ہو گئے۔ شمالی افریقہ کی فتوحات، اندلس اور سسلی کی عرب فتوحات نے دنیائے مغرب کو زیروزبر کر دیا اور یوں اسلام اور مغرب کے درمیان مستقل عداوت کی بنا پڑ گئی۔

یہ تاریخی منظر مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور مخاصمانہ کاروائیوں کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ محاربات صلیبی کو اگر ہم تحریکِ استشراق کا فوری سبب قرار دیں تو غلط نہ ہوگا۔ صلیبی جنگوں کو تاریخ یورپ بلکہ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کی تفصیل کا تو یہاں کوئی موقع نہیں البتہ اس حد تک نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دنیائے اسلام کے خلاف دنیائے یورپ کی متحدہ کوششیں چونکہ ناکام ونامراد ہوئیں اور دوصدیوں (1096ء سے 1292ء) پر محیط معرکہ ہائے صلیب و ہلال کے نتائج ارباب کلیسا کے حق میں اچھے نہ نکلے۔ اس لیے انھوں نے عسکری محاذ پر مسلسل اور پے در پے شکستوں کے بعد فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو سردست اس محاذ پہ شکست دینا ممکن نہیں اس لیے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے علمی وفکری محاذ کو منظّم کیا جائے۔ یہی فیصلہ تحریک استشراق کی شکل میں سامنے آیا۔ اس سلسلہ میں لارڈ ایلی کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے کہ فوجی اعتبار سے تو اب صلیبی جنگیں ختم ہو چکی ہیں مگر یورپی لوگ دین اسلام اور اس کی تہذیب کے بارے میں تحریراً جن خیالات کا اظہار کریں گے اُن میں تعصب کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے۔

ایک فرانسیسی مورخ (Pierre Martino) اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ جب عیسائی ترکوں کے خلاف جنگ ہار گئے تو وہ ہزرہ سرائیاں کرنے لگے یہاں تک انھوں نے عیسائیت کی شکست کا بدلہ میدان ادب میں لے لیا۔ چنانچہ تحریک استشراق کے جلو میں دنیائے مغرب کا یہ منظّم حملہ واقعتاً عسکری محاذ پر اُن کے صلیبی حملوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ مختصر یہ کہ اسلام دشمنی کی جو چنگاریاں پہلے سے دبی ہوئی تھیں وہ لو دینے لگیں اور رفتہ رفتہ اُن کی آتش عداوت دامن مشرق کو جلانے لگی۔ مستشرقین من حیث المجموع چاہے قدیم ہوں یا جدید، مغرب کے ہوں یا مشرق کے اپنی

اصل ونسل کے اعتبار سے بہر حال یہودی وعیسائی اور مشرک ہی رہے۔ گویا اختلاف دین ومذہب کی بنا پر اُن کے جذبات وخیالات تو پہلے ہی مذہبی بغض وعداوت (Religious Hostillty) کے آئینہ دار تھے ۔اس پر مستزاد یہ امر کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے حقیقی مآخذ سے دور صدیوں جہالت وبے خبری اور عدم واقفیت کا شکار رہے۔اس کا واضح نتیجہ ایک طرف تو یہ سامنے آیا کہ اسلام اور داعی اعظم کے بارے میں کم وبیش انیسویں صدی کے آواخر تک دانستہ یا نادانستہ طور پہ جو کچھ وہ لوگ لکھتے رہے اور پھیلاتے رہے وہ صریحاً ظن وتخمین اور وہم وگمان کی پیداوار تھا چنانچہ بے سر وپا روایات من گھڑت حکایات،فسانہ وفسوں لچر قصے کہانیاں اور اسی طرح کا بلا تحقیق خام مواد اسلام اور پیغمبر اسلام کی نفرت انگیز تصویر پیش کرنے کے لیے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ صدیوں استعمال کرتے رہے۔

دوسری طرف جب جہالت اور بے خبری کا پردہ چاک ہوا اور مستشرقین اسلامی مآخذ کی تحقیق وتفتیش میں منہمک ہوئے تب بھی انھوں نے دانستہ طور پر قرآن واحادیث سے کھیلنے میں تکلف سے کام نہ لیا ۔ نیز مشرقی مصادر کی ترتیب وتبویب کے سلسلہ میں تمام ترمحنتوں کے باوجود فاش قسم کی غلطیاں کرتے رہے۔ بہر حال اِن تمام باتوں کا مقصد ایک ہی تھا یعنی تشکشک وتذبذب کے بیج بو کر اسلام اور سرور عالم ﷺ کے بارے میں مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا اور انھیں آمادہ بہ نفرت کرنا۔اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مستشرقین اپنی تحقیقات کے پردہ میں ایسے خیالات کو خاموشی کے ساتھ اسلام کے نظام وفکر میں داخل کر دیں جس کا ادراک راسخ العقیدہ لوگوں کے سوا دوسرے نہ کر سکیں۔

انھوں نے یہ خیال کر لیا تھا کہ اِن کی تحقیقات سے مرعوب ہو کر اُن کی ہر بات کو بلا چوں چراں درست مان لیا جائے گا۔ چنانچہ علوم اسلامیہ کا ہر میدان انھوں نے اپنی جولاں نگاہ کے لیے منتخب کیا اور علوم اسلامیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں انھوں نے خلط مبحث سے کام نہ لیا ہو۔

مسلمانوں کا زوال وانحطاط بحیثیت مجموعی،تحریک استشراق کے فروغ کا باعث ہوا۔ادھر عالم اسلام سیاسی انتشار کا شکار ہوا،اندلس مسلمانوں کے قبضے سے نکلا ،پھر سیاسی انحطاط،معاشرتی و اخلاقی زوال اور تہذیب وثقافت کے تنزل کا باعث ہوا تو اُدھر مسیحی یورپ کی ہمتیں بلند ہوئیں بلکہ

اندلس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین لینے کے بعد تو اُن کے اندر اس قدر غرور پیدا ہوا کہ صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر پندرہویں صدی عیسوی کے بعد سے انھیں سیاسی عروج حاصل ہونے لگا تو اقوام یورپ نے ایشیا افریقہ اور دوسرے مشرقی علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ اور یوں استعماریت کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ اس کا نتیجہ واضح تھا کہ مغربی تہذیب کا غلبہ ہوتا چلا گیا اور مغربی تمدن اپنا اثر جمانے لگا۔ تب مسلم ثقافت مغلوب ہونے لگی اور اُس کی تمدنی چمک دمک ماند پڑ گئی۔ اس طرح مستشرقین کو موقع ملا کہ وہ اپنے ہتھیار تیز کر لیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی زبانیں سیکھیں، اُن کے افکار و علوم سے واقفیت حاصل کی اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ مسلمانوں کی علمی وراثت کو اپنی ترقی کے لیے استعمال کر سکیں اور تحریک استشراق کو آگے بڑھا سکیں۔

پندرہویں صدی کے بعد یورپ نے پھر سے انگڑائی لی اُس کے عہد تاریک کا خاتمہ ہوا اور اُن کے ہاں علم و تحقیق، بیداری، تہذیب و تمدن کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ یہ اُن کے سیاسی فروغ سے ہم آہنگ تھا اور انھیں ضرورت تھی کہ ایشیا اور افریقہ میں انھوں نے اپنی جو کالونیاں قائم کی ہیں انھیں مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے مادی وسائل اور اسلحہ سے زیادہ توجہ علمی و ذہنی کاوشوں پر صرف کی جائے۔ چنانچہ استعمار مغرب کے تحفظ کے لیے بجائے خود تحریک استشراق کی سرگرمی ناگزیر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے مفتوح ممالک کے تمام علوم و فنون کو حاصل کرنے اور تحقیقات کے پردہ میں اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یورپی حکمرانوں نے تحریک استشراق کی مکمل سرپرستی کی۔ یہ سرپرستی صرف مالی صورت میں نہ تھی بلکہ مستشرقین کو وہ تمام سہولتیں فراہم کی گئیں جو اُن کی تحقیق و تفتیش کے لیے ضروری تھیں۔

مذہبی و سیاسی محرکات کے ساتھ تجارتی مفادات بھی تحریک استشراق سے وابستہ تھے اقوام یورپ اور مشرقی ممالک میں رابطہ کی ابتداء تجارتی تعلقات ہی سے ہوئی تھی۔ پھر امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہی تجار بالآخر سیاہ و سفید کے مالک و حکمران بن بیٹھے خود مشرق میں مغل سلاطین کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا اور وہ مغربی تاجر جو کئی کئی دن تک تاجدارِ ہند سے ملاقات کے لیے اُس کے محل کے باہر

کھڑے رہتے تھے کہ پھر وہ وقت آیا کہ انھی تاجروں نے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے کہا کہ انھیں اب اُس کی ضرورت نہیں۔ اسباب ومحرکات اور پس پردہ عوامل کا یہ مختصر تجزیہ استشراق کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے اگرچہ ناکافی ہے۔ تاہم اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ تحریک استشراق کا بنیادی محرک رسول اللہ ﷺ سے بغض وعداوت اور اسلام سے قدیمی عناد ہے۔



کسی بھی قوم کے زوال کا آغاز اخلاقی پستی اور علم کی دوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔مسلمانوں میں یہ دونوں چیزیں در آئیں جس کا فائدہ براہ راست تحریک استشراق کو پہنچا اور وہ اپنی منزل کی طرف رواں رہی ان صفحات میں مسلمانوں کی بے اعتنائی کا تذکرہ ہے۔

تحریک استشراق،مسلمانوں کی بے اعتنائی

دنیا کی مختلف زبانوں میں بالعموم اور انگریزی اور عربی زبان میں بالخصوص مستشرقین کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے علم و تحقیق کی نوعیت و حقیقت اپنے پرایوں سب پر کھلتی جارہی ہے۔ بلکہ پچھلے ایک دو عشروں میں تو انگریزی زبان میں بعض ایسی کتابوں کی اشاعت نے خود مغربی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی معاشرتی اور ثقافتی حالات دنیا کے ہر حصے میں بہت کچھ منقلب ہو چکے ہیں۔ علم و تحقیق کی بہت سی نئی راہیں دریافت ہو چکی ہیں اور بوڑھوں کے مقابلے میں نوجوان نسل فکر و نظر کی نئی تبدیلیوں کی نقیب بنتی جارہی ہے۔ انگریزی کے علاوہ عربی زبان میں بھی مستشرقین کے حوالہ سے بعض اہم کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو تاریخی اعتبار سے جس طرح سیرت نگاری کے حقیقی دور کا آغاز سر سیّد احمد خاں (1898ء) سے ہوا اسی طرح مستشرقین کے حوالہ سے مطالعہ

سیرت کا علمی محاذ بھی سب سے پہلے دراصل سرسیّد احمد خاں نے ہی کھولا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ سرسیّد کے دینی افکار میں تجدد کا رنگ نمایاں تھا اور راسخ العقیدہ علماء کو اُن سے حد درجہ اختلاف تھا اور ہے، سرسیّد نے جذبہ ایمانی اور خالص جرأت رندانہ سے کام لے کر اپنے ہم عصر مستشرق سر ولیم مور کی دل آزار کتاب "The life of Mohammad" کی اشاعت پر خاموشی کو گناہ جانا اور تمام تر کم مائیگی کے باوجود اہانت رسول کا خاموش بدلہ لینے کے لیے اپنا تن من دھن داؤ پہ لگا دیا اور خالص علمی سطح پر میور کی کتاب پر تنقید و محاکمہ کر کے مناظرانہ رنگ سے پاک تاریخی حقائق و اسناد پر مبنی ایک جوابی کتاب ''**الخطبات الاحمدیہ علی العرب و السیرت الحمدیہ**'' لکھی۔ یوں انیسویں صدی کے اواخر سے گویا مستشرقین کے مقابلہ میں ایک جوابی علمی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ یہ بڑا اہم دور تھا یہی وہ زمانہ تھا جب مستشرقین یورپ فی الواقع سیرت الرسول ﷺ کے اصل عربی مآخذ سے علمی طور پر واقف ہوئے اور پھر انھی منظّم کوششوں سے بہت سے مآخذ حلیہ طبع سے آراستہ ہو کر مسلمانوں تک پہنچے۔

اسی دور میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر اپنے شدید حملے جاری رکھے اور تلاش کر کر کے مجروح اور نا قابل اعتماد روایتوں کو بطور اسلحہ استعمال کیا تا کہ مسلمانوں کے دل سے سیرت رسول اللہ ﷺ کا اعتبار اُٹھ جائے اور اُس کے منطقی نتیجے کے طور پر آپ ﷺ کا لایا ہوا دین بھی بے اعتبار و بے وقعت ٹھہرے۔ سرسیّد احمد کی مخلصانہ کوششوں سے تحریک استشراق کے بالمقابل جس علمی تحریک کا آغاز ہوا تھا اُسے بعد میں مزید توسیع و ترقی حاصل ہوئی اور بہت سے مسلمان علماء نے خاص اس مسئلہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اِن میں پروفیسر سیّد نواب علی، قاضی سلیمان منصور پوری، جسٹس امیر علی اور علامہ شبلی نعمانی وغیرہ شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں اگرچہ متعدد بزرگوں نے قلم اٹھایا اور مستشرقین کے ابطال میں کتابیں لکھیں۔ تاہم اس ضمن میں جو شہرت عام اور بقائے دوام علامہ شبلی نعمانی (م1914ء) کو حاصل ہوا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ علامہ شبلی نعمانی کو یہ تقدم بھی حاصل ہے کہ انھوں نے مستشرقین کی انفرادی کوششوں ہی کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ انھوں نے پورے گروہ مستشرقین کو اپنے سامنے رکھا جو اسلام اور علوم اسلامی پر بالعموم اور سیرت الرسول ﷺ پر بالخصوص طبع

آزمائی کر رہا تھا۔ چنانچہ اُن دنوں علامہ شبلی نعمانی کے ذہن پر صرف اور صرف مستشرقین ہی کا خبط سوار تھا اور آپ چاہتے تھے کہ مستشرقین کے ہر ہر جھوٹ کی قلعی کھول دیں مگر افسوس کہ اُن کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اس کام کو نامکمل چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ تاہم جب وہ سیرت النبی ﷺ تحریر کر رہے تب اُن کے درد کا اندازہ اُن خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو اس ضمن میں وہ اپنے دوستوں کو لکھا کرتے تھے۔ اپنے ایک دوست مولوی حبیب الرحمان کو لکھتے ہیں کہ:

''جوں جوں انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں پہ نگاہ ڈالتا ہوں تو کذب وافترا کا وہ جنگل نظر آتا ہے جسے کاٹے بغیر رسول اللہ ﷺ کی اجلی صورت کبھی بھی اہل مغرب کے سامنے جلوہ گر نہ ہو سکے گی، مارگولیس، ولیم موراور منٹگمری واٹ اس دھڑلے سے جھوٹ بولتے ہیں اور ایسا جھوٹ بولتے ہیں کہ دل جل کے رہ جاتا ہے، سیرت النبیؐ کے سو صفحے ہو چکے ہیں لیکن نظر ثانی میں پھر کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اہل یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے، اُن کے ایک ایک حرف کے لیے سینکڑوں کتابیں دیکھنی پڑتی ہیں ہزاروں صفحات سے گزرنا پڑتا ہے یہ کمبخت جھوٹ بھی اس مشتاقی سے لکھتے ہیں کہ حوالہ ساتھ ہی درج ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں سیرت نگاروں نے بہت سی غلطیاں کی ہیں جن کو اٹھا کر وہ ہمارے منہ پہ دے مارتے ہیں، یہی بے احتیاطیاں ہیں جن کی بدولت اہل مغرب حوالہ کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں اور اُس کو بڑھا لیتے ہیں اپنے لفظوں میں ڈھال لیتے ہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، خیر اب تو میں اس میدان میں اتر چکا ہو دیکھیں کیا ہوتا ہے اب صرف ایک ہی آنکھ سے نظر آتا ہے مگر خدا کی قسم میں یہ کام تب تک جاری رکھوں گا جب تک میری سانس چلتی رہے گی۔ میری خواہش ہے کہ میں دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں جو اہل مغرب کی ہرزہ سرائیوں کا مکمل جواب ہو جائے''۔(3*)

****

علامہ شبلی نعمانی نے تحریک استشراق کے جواب میں جس علمی و تحقیقی کا کام کا نقشہ مرتب کیا تھا اگر وہ پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا تو مستشرقین کے اعتراضات اور مطاعن کا یادگار جواب بن جاتا۔ سیرت النبی لکھتے ہوئے انھوں نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ جلد پنجم خاص مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں لکھی جائے گی مگر افسوس کہ وہ سیرت النبی ﷺ کی صرف ایک جلد لکھ سکے اس کے بعد وفات پا گئے۔ ازاں بعد اُن کے شاگرد علامہ سیّد سلمان ندوی نے اپنے استاد کے ادھورے کام کو مکمل کیا مگر انھوں نے مستشرقین کو قطعاً قابل اعتناء نہیں جانا۔

علامہ شبلی نعمانی چونکہ اپنی کتاب سیرۃ النبی کو دائرۃ المعارف بنانا چاہت تھے اس لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ مستشرقین کے مطالعہ سیرت کو معیار تنقید پر نہ پرکھتے اور زیر بحث نہ لاتے ، بلکہ مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات کا پردہ چاک کرنا اور سیرت کے حوالے سے اُن کی غلط بیانیوں پر تنقید و تعقیب تو گویا منتہائے مقصود تھا اور اُن کی زندگی کی آخری خواہش بھی ،علامہ شبلی نعمانی نے جس قدر کام بھی مستشرقین کے حوالے سے کیا وہ اگرچہ مختصر ہے مگر اس کے باجود وہ آنے والوں کے لیے چراغ راہ کی مثل ہے جس کی روشنی میں اس کام کو آگے بڑھایا جاسکتا تھا۔ مگر افسوس کہ علامہ شبلی نعمانی کے بعد مستشرقین کے حوالہ سیرت رسول اللہ ﷺ کے مطالعہ و تحقیق کا کوئی بڑا اور منظّم کام سامنے نہیں آیا اور نہ ہی ہمارے ہاں سیرت نگاروں نے اس مسئلہ سے تعرض کو قرار واقعی اہمیت دی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انفرادی سطح پر کوششیں ضرور کی جاتی رہیں اور اس ضمن میں بہت سے مقالات اور مضامین بھی سامنے آئے اور کچھ نہ کچھ پیش رفت بہر حال جاری رہی۔ مثال کے طور پر دیکھیں کہ محمد حسنین ہیکل کی کتاب "حیات محمدؐ" اگرچہ عربی زبان میں لکھی گئی تھی لیکن شاندار اردو ترجمہ کے بعد اب یہ کتاب گویا اردو ادب کا حصہ ہی بن گئی ہے۔

محمد حسین ہیکل نے مستشرقین کو خاطر خواہ جواب دیئے ہیں اور اس ضمن میں اُن کے کام کو قابل قدر قرار دیا جاسکتا ہے۔ محمد حسین ہیکل کے اپنے بیان کے مطابق نہ صرف یہ کہ انھوں نے جامدین عن المسلمین کے جمود آمیز خیالات کا رد کیا بلکہ مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا مثبت انداز میں جواب دینے کے لیے الگ سے ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام " **المستشرقون و الحضارۃ الاسلامیہ** "

بیان کیا گیا ہے۔اس کتاب میں مصنف نے مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور اُن کے علم و تحقیق کا سنجیدہ علمی تجزیہ کیا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت جیسے، اسلام اور مسیحیت کی کشمکش، مسیحی مصنفین کی نظر میں آنحضرت محمد ﷺ کا مقام، مسلمان مصنفین اور مغربی افتراپرداز، جیسے مضامین لکھے۔انھوں نے نہ صرف یہ کہ اصل حقائق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ جرأت وقوت کے ساتھ مسیحی سوانح نگاروں کے مطاعن کا جواب دینے کی سعی بھی کی ہے۔یہ جائزہ اگرچہ مختصر ہے لیکن یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ مستشرقین کی برپا کی ہوئی تحریک استشراق کا قرار واقعی جواب اردو زبان وادب میں اب تک نہیں دیا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد احمد خاں نے جس جوابی علمی تحریک کا آغاز کیا تھا اور جسے علامہ شبلی نعمانی نے موثر بنانے کا خواب دیکھا تھا وہ خواب ٹوٹ گیا اور اس تحریک کا رنگ آہستہ آہستہ پھیکا اور آہنگ روز بروز مدھم ہوتا چلا گیا۔

یہاں تک کہ اس ضمن میں اب سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ اُدھر مغربی یورپی مستشرقین کی سرگرمیاں تو لب ولہجہ کے فرق کے ساتھ تا حال جاری وساری ہیں اور اُن کے عزائم ومقاصد میں کوئی فرق نہیں آیا۔لیکن اِدھر ہمارے ہاں اس کا جواب دینے کا انتظام و اہتمام صفر ہے۔مولانا شبلی نعمانی نے مستشرقین کی علمی تحقیقات اور اُن کے معیار کی جونشاندہی کی تھی اور اُن کی تصانیف کو جس طرح کذب وافترا کا دفتر قرار دیا تھا اُس کا تقاضا تھا کہ مستشرقین کی کتابوں کو کھنگالا جاتا اور تمام علوم اسلامی میں بالعموم اور سیرت الرسول ﷺ کے باب میں بالخصوص واقفیت تامہ حاصل کر کے اُن کی غلطیوں، بددیانتیوں اور تلبیس وتحقیق کا پردہ چاک کیا جاتا۔اس سلسلہ میں بڑے پیمانہ پر ایک منظّم کام کا نقشہ بنایا جاتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوسکا۔

بلکہ المیہ تو یہ ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت وشدت کو سمجھا ہی نہیں گیا اور نہ ہی ہمارے ہاں ایسے ادارے وجود میں آئے جو اعلیٰ سطح پر علم وتحقیق کی سرپرستی کر سکیں اور اُن کی کوششوں کو متحد ومنظّم کر سکیں جو انفرادی واجتماعی نیز نجی وسرکاری مختلف پیمانوں پر کی جاتی ہیں۔ ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اُس معیار کی علمی وفنی تیاری نہیں پائی جاتی جو مستشرقین کا طرۂ امتیاز رہی ہے کہ مستشرقین کے حملوں کا دفاع محض عبارت آرائی یا جوابی الزام تراشی سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اِس کے لیے اُسی

تیاری کی ضرورت ہے جس قسم کی تیاری خود مستشرقین نے کی تھی۔ مثلاً علم و تحقیق کے اداروں کا قیام، مختلف زبانوں کی تحصیل، تجسس و تفحص کے آداب، فنی مہارت اور جدید تکنیک سے واقفیت، ادب و ثقافت کا گہرا مطالعہ، ضروری علوم وفنون سے دلچسپی مشنری جذبہ، متعین مقاصد اور انتھک محنت و ریاضت وغیرہ۔ اس پہ مستزاد یہ کہ تحریک استشراق کو یک گونہ تقویت خود اُن مسلمان محققین و علماء کے رویہ سے مل رہی ہے جو دنیائے مغرب کے مختلف اداروں میں حصول علم کے لیے جاتے ہیں اور اُن کے احوال و مناظر سے اس درجہ متاثر و مرعوب ہو جاتے ہیں کہ انھیں کے ہم نوا و ہم آواز بن کے رہ جاتے ہیں۔ اس لیے ضروت اس امر کی ہے کہ جوابی علمی تحریک کو نئے سرے سے منظم کیا جائے اور مرحلہ اول میں مسئلہ استشراق کی نوعیت و حقیقت کو سمجھ لیا جائے اور یہ جائزہ لے لیا جائے کہ استشراق و مستشرقین کی تحریک، اُس کے مقاصد اسباب و محرکات، عہد بہ عہد ارتقاء اور اعلام و مشاہیر کی عام صورت کیا ہے۔ تو اِن راہوں پر چلتے ہوئے مسلمان ایک تو فریضہ دعوت کی طرف متوجہ ہو جائیں گے دوسرے اہل مغرب کے سامنے اسلام اور پیغمبر اسلام کی اجلی صورت ابھر آئے گی جس کے مثبت نتائج کو سامنے آنے سے کوئی نہ روک سکے گا۔ انشاء اللہ



ہمارے ہاں سے جب علم و تحقیق کی روایت رخصت ہوئی تو مغرب نے علم کی راہ پہ اپنے قدم تیز تیز اٹھانے شروع کر دیئے یہی وجہ ہے تحریک استشراق کو بہت سے محاذوں پر کامیابی حاصل ہوئی اور مسلمان تہذیبی تمدنی اور معاشی میدانوں میں پستی کی طرف رواں رہے۔

تحریک استشراق، آج اور کل

مستشرقین نے اپنی قوم کو مسلمانوں کی خامیوں اور کمزوریوں سے آگاہ کر دیا تھا جس کا انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور جونہی طاقت کا توازن ذرا سا مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا تو اہل مغرب نے اپنا شکنجہ ان کے گرد کسنا شروع کر دیا۔ دنیائے اسلام پہ غلبہ حاصل کرنے کے لیے تحریکِ استشراق نے صدیوں جو خواب دیکھے تھے اب ان کی تعبیر کا وقت قریب تھا۔ کیونکہ مسلمان اب تساہل انتشار اور انارکی کا شکار تھے اگرچہ وہ آج بھی دنیا کے بہت بڑے حصے پہ پوری شان وشوکت سے حکومت کر رہے تھے۔ مگر اہل مغرب کے مستشرق کی شاطر نگاہ دور تک دیکھ رہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ اب مسلمانوں کے اقتدار کا سورج نصف النہار کی منزل عبور کر چکا ہے اور اب یقیناً ہر گزرنے والا دن اس کے وقتِ زوال کو قریب لائے گا۔ انھوں نے اپنی قوم کو ضروری تیاری کے لیے مہمیز فراہم کی ان کے جذبات کو ابھارا اور ایسے تمام اقدامات کیے جن سے اسلامی دنیا پہ قبضے کی راہ ہموار ہو۔ انھوں

نے مسلمانوں کے سیاسی ، سماجی ، دینی اخلاقی اور معاشی حالات کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ اور جغرافیے سے خود کو آگاہی باہم پہنچائی۔ اس کے علاوہ انھوں نے عالم اسلام کے کونے کونے میں بکھرے علم و معرفت کے ذخیرے اکٹھے کیے اور ان کو مغرب میں پہنچایا جہاں ان کے تراجم مقامی زبانوں میں کیے گئے تا کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن کو درست طور پہ سمجھنے کے بعد مغرب کے استعماری تسلط کی راہ ہموار کر سکیں۔ پھر اس مہم میں تیزی آتی چلی گئی اور مسلمان مفکرین نے اسپین کی وسیع اور علمی سرزمین پر آج تک جو تحقیقی کام کیا تھا وہ تمام علمی ذخائر مغربی زبانوں میں منتقل ہو نے لگے اور ان کے ہاں بھی تحقیقی اور سماجی شعور نے جنم لینا شروع کیا۔ مستشرقین کی کوششوں سے اہل مغرب کے ہاں اب اس معاشرے کا جنم ہو چکا تھا جس کو علم دوست معاشرہ کہا جا سکتا ہے اور ان کے ہاں بہت سے علمی مصادر عام ہونے لگے تھے متنوع موضوعات پہ مشتمل کتابوں کا ایک انبار تھا جس کا سامنا یورپ کا ان پڑھ معاشرہ کر رہا تھا۔

یہ مسلمانوں کے ہاں صدیوں سے موجود احساسِ فتح کا ناقص ترین نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں علم کی طلب ذوقِ تحقیق اور فکری جستجو ختم ہونے لگی۔ ایک عمومی اطمینان کی کیفیت تھی جو عالم اسلام میں چہار سو چھائی ہوئی تھی، ایک جمود تھا جس نے مسلمان سے فکر و نظر ذوقِ جستجو اور تحقیق کے سب سوتے خشک کر دیئے تھے جہاں کبھی ابن سینا، فارابی، حجۃ الاسلام امام محمد بن غزالی اور ابن رشد جیسے محقق پیدا ہو تے تھے وہاں اب صدیوں سے فکری جمود نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور تاریخ کا مسلمہ اصول ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کے پیچھے ان کا فکری زوال کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ علم مسلمانوں کے ہاں سے رخصت ہونے لگا۔ پھر زیادہ عرصہ نہیں لگا کہ علمی اور فکری دنیا کا مرکز قرطبہ سے لندن منتقل ہو گیا۔ کیمبرج اور آکسفورڈ نے جنم لیا اور یورپ نے اپنی تاریخ کی وہ انگڑائی لی جسے لوگ آج نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پھر تحریک احیائے مذہب یا تحریک احیائے علوم (Reformation) شروع ہوئی۔

مغرب نے اپنا وہ سفر شروع کیا جو آج تک جاری ہے مگر کتنے لوگ جانتے ہیں کہ ماڈرن سائیکالوجی کے بانی ڈیکارٹ نے امام غزالی کی کتابیں اپنے نام سے شائع کرا لیں تھیں۔ علم فلکیات، طب،

تاریخ ،جغرافیہ، حکایات ریاضی اور فلسفہ کی ہزاروں کتابیں تھیں جن کو یورپ کے لوگ اپنے ناموں سے شائع کرا رہے تھے اور ان کے معاشرے میں وہ علمی انقلاب جنم لے رہا تھا جس سے وہ کبھی آشنا نہ تھے۔اس طرح ملت اسلامیہ کا زوال اور اہل مغرب کا عروج شروع ہوا۔اگر چہ مسلمانوں ہی کی علمی جرائتوں اور افکار کی تازگی نے اہل مغرب کو ترقی کی اس راہ پہ ڈالا مگر آج کے مسلمان نوجوان کو کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ اہل مغرب کا تمام تعمیری اثاثہ دراصل مسلمان اہل دانش کی اس بصیرت پر کھڑا ہے جو انھوں نے صدیوں کی محنت سے استوار کیا تھا۔تحریکِ استشراق نے جب اپنے مقاصد کو عملی شکل میں پورا ہوتے دیکھا تو انھوں نے اپنے بادشاہوں کو بھی اپنے رویہ پر نظر ثانی پر مائل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے بھی اپنا نقطہ نظر بدل لیا اور تحریکِ استشراق کی تاریخ میں پہلی دفعہ اب سیاسی اور سماجی ادارے بھی ان کی پشت پر کھڑے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ بھی اسی علمی اور فکری مہم کا حصہ بن کے رہ گئے جو مستشرقین کا خواب تھا ۔مثال کے طور پہ دیکھیں کہ فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم نے تمام اسلامی ملکوں سے مخطوطات خریدنے کے لیے اپنے کارندے بھیجے۔

اس دور کے مغربی حکمرانوں کے ہاں مشرقی علوم کے حصول یا مخطوطات جمع کرنے میں مقابلے کی اس فضاء کو جنم دیا جس نے آج کی مسلمان امت کو تہی دست بنا کے رکھ دیا۔دوسری طرف علم کی حفاظت اور محبت کا یہ عالم ہے کہ برلن، پیرس، میلانو، روم، لندن، لیبزج، لیڈن، آکسفورڈ، کیمبرج، میونخ، ڈبلن ایڈمبرا، لینن گراڈ، برٹش ایشیاٹک سوسائٹی اور اسکوریال کی لائبریریاں مخطوطات کی شکل میں مسلمانوں کے علمی ورثے سے بھری پڑی ہیں۔

مستشرقین نے علم کے حصول اور مسلمانوں کے تہذیب وتمدن کو باریکی کے ساتھ جانچنے کے لیے سفر کئے ،انجمنیں قائم کیں ،کانفرنسیں کیں ،غرض انفرادی اور اجتماعی سطح پر مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کا ہر ہتھکنڈہ آزمایا گیا۔مستشرقین کی یہ سازشیں شاید کامیاب نہ ہوتیں مگر خود مسلمان مملکتوں کے اندر جو انتشار جنم لے چکا تھا اس نے بالآخر مستشرقین کے خوابوں کو حقیقت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔چنانچہ مسلمان مقبوضہ جات ایک ایک کر کے اُن کے ہاتھ سے نکلتے رہے۔اگر چہ اسلام کو ختم

کرنے یا تصورِ اسلام کو مکمل طور پہ مسخ کرنے کا خواب تو مستشرقین پورا نہ کر سکے۔ تاہم ان کی اس عظیم الشان تحریک نے مسلمان کو سماجی سیاسی اور معاشی محاذوں پہ شکست سے دوچار کر دیا علم سے دوری کی وجہ سے نظام عالم پہ مغرب کا غلبہ بڑھتا رہا اور مسلم دنیا سکڑتی رہی اور ایک وقت وہ بھی آیا جب مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات بھی مغربی نو آبادیوں میں شامل تھے۔ دور دور تک اطالوی ولندیزی یا پھر انگریز قابض تھے۔ تقریباً تمام مسلم ممالک اب مغربی نو آبادیوں میں ضم ہو چکے تھے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ اسی طرح گذر گیا۔ مسلمان اگرچہ ہر جگہ مغلوب تھے مگر اپنے مقدس عقائد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور قرآن کی آفاقیت کا تصور ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے ہاتھ سے نہ نکلا۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرق کا یہ خواب کہ جلد یا بدیر وہ یا تو اسلام کو ختم کر دیں گے یا پھر اسے عیسائیت کی ایک شاخ قرار دے کر اس میں ضم کر دیا جائے گا پورا نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی بنیادی اساس توحید نے ہر قدم پہ صیہونی عقائد کا راستہ روکا اور اسے اسلام کا حصہ بننے یا اسلام کو عیسائیت کا حصہ بننے سے روکا۔

پھر نو آبادیاتی نظامِ استبداد کی گرفت کمزور پڑنے لگی اور مسلمانوں کے اندر مغربی استعمار سے آزادی کی تحریکوں نے جنم لینا شروع کیا۔ مغربی استعمار اب خود اندرونی خلفشار کا شکار تھا۔ اطالوی اور ولندیزی طاقتوں میں باہمی مفادات الگ ہو چکے تھے اور مسلمان ممالک میں آزادی کی تحریکوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک حل تو یہ تھا کہ اہل مغرب مسلمانوں کی بیداری کی اس لہر کو طاقت سے کچل دیں یا پھر مقبوضہ جات خالی کر کے نکل جائیں۔ ابھی وہ اس مخمصے میں ہی تھے کہ دوسری جنگ عظیم نے ان کی اس طاقت اور اجتماعیت کو پامال کر کے رکھ دیا جس کی بدولت وہ گذشتہ کئی صدیوں سے دنیا کے بیشتر حصے پہ قابض تھے۔ چنانچہ اہل مغرب نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور اپنی نو آبادیات کو خالی کرنے لگے جہاں پھر سے مسلم ممالک ابھرنے لگے اور صرف ایک صدی میں اٹھاون مسلم ممالک دنیا کے نقشے پہ ابھر آئے۔ مستشرقین کا خواب پھر سے بکھر گیا مگر وہ ایک بار پھر سے نئے عزم کے ساتھ میدان میں اترے ہیں۔ ان کی جانفشانی مثالی ہے اور وہ اپنے تصور کو آفاقی سمجھتے ہیں اس لیے ہر دور میں اپنے وجود کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ اب کے انھوں نے نئے ہتھیاروں نئی چالوں اور

نئے بہروپ سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ چنانچہ جن علاقوں پہ وہ حکمران تھے انھیں یونہی چھوڑ کر چلے جانے کا فیصلہ ان کے حکمرانوں کی سیاسی مجبوری رہی ہو مگر مستشرقین اپنی ہٹ کے پکے تھے وہ پھر سے اپنی چالوں میں مگن ہو گئے۔ اب تک وہ مسلمانوں کے حکمران تھے اور ان کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھتے تھے اور ان سے ہر طرح کا سلوک روا رکھتے تھے۔ مگر اب جب مسلمانوں نے پھر سے اپنے علاقوں کا کنٹرول سنبھال لیا تھا تو مستشرقین کی پہلی کوشش یہ تھی کہ وہ اس نفرت کا ازالہ کریں جو مسلمان اُن کے رویے کے باعث اُن سے کرتے ہیں۔ اس لیے اب انھوں نے مسلمانوں کی دوستی اور خیر خواہی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمان جسمانی طور ان کے غلبے سے آزاد ہو کر بھی ان کی ذہنی غلامی سے آزاد نہ ہو پائیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایسی تمام چیزیں جو مسلمانوں کے دلوں میں اہل مغرب کے خلاف نفرت پیدا کرتی تھیں چھوڑ دی جائیں اور اُن اثرات کو کم کرنے کی کوشش کی جائے جو ان کے پیشرووں نے کئی سو سال تک اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قلم و کتاب کی صورت چھوڑے تھے۔ جن کی وجہ مسلمان اُن سے بری طرح متنفر تھے۔

گذشتہ ادوار کے مستشرقین کی کتابیں مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے عیسائیت سے بیزار کر سکتی تھیں اس لیے انھوں نے اب یہ انداز اپنایا کہ کئی مستشرقین نے تو سابقہ ادوار کے مستشرقین کی اصناف و افکار پر شدید تنقید کی اور دوسری طرف مستشرقین کا ایک گروہ ایسی کتابیں لکھنے میں مصروف ہو گیا جن میں اسلام اور اس کے اصولی موقف کو کسی حد تک سراہا گیا تھا۔ انھوں نے بہت سے پہلووں سے افکار ِ اسلام کی صداقت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس کی توصیف و تعریف بھی کی۔ مگر یاد رہے کہ ان مصنفین کا مقصد حق و صداقت کو تسلیم کرنا قطعاً نہ تھا۔ بلکہ صرف اور صرف مسلمانوں کے علمی طبقات کی نظر میں اپنے عدل کا اظہار تھا اور ان کی کسی حد تک حمایت حاصل کرنا تھا۔ ادھر مسلمان جب نو آبادیاتی نظام سے باہر آیا تو نہ اس کے پاس وسائل تھے اور نہ ہی علم کہ وہ جلد ہی امت کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس دلا سکے۔ چنانچہ خطہ ارض پہ مختلف مقامات پر اگر چہ اب مسلمان حکمران تھے مگر ان کی حالت ہر پہلو سے دِگرگوں تھی۔ وہ غلامی کا طویل دور گذار کر آزاد ہوئے تھے اس لیے انھیں سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کون

سارا ستہ امت کو درست سمت میں لے جائے گا۔ان میں باہمی اعتماد کا بھی فقدان تھا اور علمی معاشی اور سماجی پستی بھی ان کی ترقی کی راہیں روکے کھڑی تھی۔اس لیے امت ابھی منتشر اجزا کا مجموعہ تھی جس کو اپنے سماجی اور معاشی ڈھانچوں کی تعمیر کے لیے کافی وقت درکار تھا۔وہ علمی طور پہ نہایت پست تھے جب کہ ان کے برعکس مستشرقین فوراً ہی فعال ہو گئے تھے یہی وجہ ہے کہ امت کے بہت سے طبقات مستشرقین کے اس نئے اور سفید چولے کے اندر چھپے زہر کا ادراک نہ کر سکے اور کئی لوگ منٹگمری واٹ اور تھامس کارلائل جیسے مستشرقین سے فوراً ہی متاثر ہو گئے اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ تو ان کو منصف مزاجِ عالم ، بے لاگ مبصر اور غیر جانبدار محققین کے خطاب دینے لگا۔تحریکِ استشراق کی تاریخ کے اس دور میں مستشرقین اپنی حکومتوں کے دستِ راست بن کے سامنے آئے ۔ان کی پشت پہ ان کی ریاستیں کھڑیں تھیں اس لیے اب کے ان کے اہداف بھی بڑے تھے۔ان میں سے کئی تو اپنے اپنے ملک کی وزارت خارجہ کو براہ راست ''ڈکٹیٹ'' کرتے اور وہ مشیرانِ خصوصی خیال کیا جاتے۔

ان کے نظریات اور تصورات پر خصوصی توجہ کی جاتی اور ان کے نشان زدہ مقامات کو ہدف بنایا جاتا۔ مسلم ممالک اپنے اندرونی خلفشاروں انارکی اور سیاسی عدم استحکام کی بنا پر اور سب سے بڑھ کر تباہ شدہ معاشیات کی وجہ سے آسانی سے مستشرقین کی خصوصی عنایات کا ہدف بننے لگے۔استعماری طاقتوں نے نوآبادیاں خالی کرتے ہوئے بھی مستشرقین کے مشوروں کی وجہ سے مسلمانوں پہ ایسے وار کیے کہ مسلم ممالک آج تک ان اثرات کے زیر اثر ہیں۔مثال کے طور پہ نصابِ تعلیم قوموں کی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم اپنے مدارس میں آج تک وہی نصاب پڑھا رہے ہیں جو مستشرقین ہمیں جاتے جاتے عطا کر گئے تھے۔چنانچہ یہی وہ نصاب تھا یہی وہ نظام تعلیم تھا جس نے دین کو دنیا سے جدا کر دیا۔علوم جدیدہ کو مسلمانوں کے روایتی علوم سے الگ کر دیا گیا۔نصاب تعلیم کی اس تقسیم نے ملت کو منقسم کر دیا اور امت مسلمہ جس کی بنیاد ہی علم پہ قائم تھی وہ علم کے میدان میں اقوام عالم سے بہت پیچھے رہ گئی۔کبھی مسلمانوں کے ہاں رواج تھا کہ تین مضامین ان کے لیے لازمی تھے جس میں علم ہیئت ،طب اور قرآنی علوم شامل تھے۔چنانچہ مستشرقین

نے جو زہر پھیلایا تھا یہ اسی کا اثر ہے کہ آج کے مسلمان کو عربی زبان اور دیگر علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مغرب ہی کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ آج ہمارے محققین دین کو سمجھنے کے لیے ان علمی مصادر کی طرف رجوع کرتے ہیں جو مستشرقین کے وضع کردہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ استعماری طاقتوں کے چلے جانے کے باوجود بھی مسلمان عملاً انھیں کے غلام ہیں۔ اگرچہ اب اس غلامی کی صورتیں بدل چکی ہیں ۔اب استعماری طاقتیں کمزور اقوام کو سودی قرضوں کے چنگل میں کستی ہیں اور پھر ان ممالک کی داخلی اور خارجی پالیسیاں انھی کے اشارے پہ بنتی ہیں۔

ظلم کی حد تو یہ ہے کہ ووٹ مسلمان ممالک کے شہری دیتے ہیں لیکن اقتدار اُسے ملتا ہے جو امریکہ کا منظورِ نظر ہو اسی زمانے میں قدرت نے مسلمانوں کو زرِ سیال کی دولت عطا کر دی یہ صورتِ حال اہل مغرب کے لیے بڑی تشویشناک تھی۔ اس دولت کے ذریعے مسلمانوں کی اقتصادی حالت درست ہو سکتی تھی۔ اور مسلمان اس اقتصادی طاقت کو سیاسی سماجی اور مذہبی معاملات میں بھی استعمال کر سکتے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ نئی دولت ایک مرتبہ پھر سے مسلمان کو ایک زندہ اور غیور قوم بنا دے جس کا نقصان سراسر اہل مغرب کو اٹھانا پڑتا۔ چنانچہ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر مسلمان جاگ گیا تو مغرب کی ذہنی اور اقتصادی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ اس سے قبل بھی وہ اپنے مذہب اپنی تہذیب اپنی زبان اور اپنے طرزِ حیات پہ فخر کرتا ہے اس لیے مغرب نہیں چاہتا تھا مشرق کا یہ نخچیر زبوں ان کے شکنجے سے آزاد ہو جائے اور ساری دنیا کو عیسائی بنانے کا خواب چکنا چور ہو کے رہ جائے اہل مغرب اس روزِ بد سے خوف زدہ تھے جب مشرقی اقوام کے مقابلے میں اقوام مغرب کا نسلی برتری کا تخیلاتی محل دھڑام سے زمین بوس ہو جائے۔

چنانچہ اہل مغرب اس سنگین صورت حال کو کسی خاموش تماشائی کی طرح نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے انھوں نے کچھ کرنے کا فیصلہ کیا اور ہمیشہ کی طرح اب بھی مستشرقین ہی ان کے کام آئے۔ مستشرقین نے اب اپنے کام کو جدید بنیادوں پہ استوار کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اس لیے اس نے روایتی ہتھکنڈوں کی بجائے جارحانہ اقدام کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ مستشرقین نے اب اسلام کے روایتی مطالعے کی بجائے دورِ حاضر کے مسلمان معاشروں میں پائے جانے والے رجحانات کا تفصیلی مطالعہ

شروع کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ان کے مطالعے کا مرکز پورا مشرق نہ تھا بلکہ وہ خاص معاشرے تھے جہاں قدرت نے تیل کے وسیع ذخائر پیدا فرما دیئے تھے۔ اب مستشرقین نے ایشیاٹک سوسائٹیاں بنانے کی بجائے مشرق وسطیٰ کے نام سے سوسائٹیاں قائم کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ مستشرقین اس دور میں جو کام کر رہے ہیں گو وہ خفیہ ہے مگر اس کے اثرات روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔

چنانچہ وہ اسلامی ممالک جن میں رزِ سیال کی دولت ہے جہاں کی زمین سے سیاہ سونا نکلتا ہے، جہاں کے لوگوں کے مقدر پہ اللہ نے اپنی رحمت کا خاص سایہ کیا ہوا ہے وہی ممالک اب اہل مغرب اور ان کے مستشرق کا ہدف ہیں۔ اہل مغرب دنیا میں جمہوریت کا راگ الاپتے نہیں تھکتے ۔ وہ خود کو شہنشاہیت کا دشمن قرار دیتے ہیں اور اسے دورِ غلامی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر ان کے رویے کی دوغلی پالیسی پہ انسان ششدر رہ جاتا ہے کہ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک کے لیے وہ جمہوریت کو پسند نہیں کرتے بلکہ ان ممالک پہ (ایران کے سوا) عام طور پہ وہی لوگ حکومت کرتے ہیں جو امریکہ کے مفادات کا دلجمعی سے تحفظ کر سکیں۔ اول تو انھوں نے مسلم ممالک خاص طور پہ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم کر رکھا ہے اور ہر ریاست میں ایک شاہ امریکہ کی غلامی کر رہا ہے۔ صلیبی جنگوں سے ہی اہل مغرب نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنی عورتوں کو استعمال کرنے کا طریقہ جاری رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عرب ریاستوں کے حکمرانوں کی ایک بغل میں گوری چمڑی والی ایک عورت ہوتی ہے اور دوسری بغل میں اسی گوری عورت کی لائی ہوئی شراب یہ عورتیں بھی مستشرقہ ہیں جو اپنے ممالک کے مفادات کا تحفظ اپنے بے پناہ حسن اور شہوانی حرکات سے کرتی ہیں۔

اہل مغرب کسی صورت تیل پیدا کرنے والے ممالک میں جمہوری نظام حکومت قائم نہیں ہونے دینا چاہتے اس لیے کہ اگر ان ممالک میں جمہوریت قائم ہو جائے تو ان ممالک کی داخلی اور خارجی پالیسیوں پر امریکہ کا کنٹرول ختم ہو کے رہ جائے گا۔ ماضی قریب میں ہم نے دیکھا کہ تیس سے زیادہ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک میں سے صرف ایران ایک ایسا ملک ہے جس نے ایک طویل جدو

جہداور لازوال قربانیوں کے ذریعے امریکہ کے شاہ کو بمشکل اپنے ملک سے نکال باہر کیا اور وہاں ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوا جو عوامی امنگوں کی امین ہو۔ چنانچہ صرف ایران ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے مغربی استعمار سے مکمل نجات حاصل کی ہے اور اپنے ہاں ان نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے جن کی بنا پہ ایران میں ایک عظیم اسلامی انقلاب رونما ہوا۔

چنانچہ مستشرق ایک بار پھر سے متحرک ہوئے اور عراق کو اکسا کر ایران پہ حملہ کرادیا اس طرح دو تیل پیدا کرنے والی طاقتیں اپنے وسائل اس لاحاصل آگ میں جھونکنے لگیں جو مستشرق کے شاطر ذہن نے جلائی تھی۔ اس آٹھ سالہ طویل جنگ میں دونوں ملکوں کو بے پناہ جانی اور مالی نقصان کا سامنا تھا مگر باقی ساری اسلامی دنیا سوائے تماشا دیکھنے کے اور کچھ نہ کرسکی۔ پھر عراق ہی کے ذریعے کویت پہ حملہ اور پھر کویت کی حمایت میں عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا اور وہاں پر اپنے فوجی اڈے قائم کرنا بھی تیل کے اسی خطرے سے نمٹنے کی ایک صورت تھی۔ چنانچہ آج کے مسلمان کو کسی خوش فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ اہل مغرب آسانی سے مسلمانوں کو کبھی اس بات کی اجازت دیں گے کہ وہ اپنی تیل کی دولت اپنی عوام کی مرضی اور امنگوں کے مطابق خرچ کرسکیں گے۔ اہل مغرب کی یہ استحصالی پالیسی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اسلامی ممالک اپنے رویوں کی ازسرنو تعمیر کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

ان کے عوام زندگی کی بنیادی سہولتوں کے حصول میں اس وقت تک ناکام رہیں گے جب تک ان کے ہاں شاہی استحصال جاری ہے۔ وہ اس وقت تک سیدھے سیدھے خود کو امریکہ یا مغرب کی غلامی میں سمجھیں جب تک ان کے ممالک میں معروف دستور کے مطابق جمہوری حکومتوں کا قیام عمل میں نہیں آتا۔ جب تک مسلمان اپنے دوست اور دشمن میں تمیز کرنا نہیں سیکھ جاتا، جب تک وہ ایک آزاد قوم کی طرح دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتا اس وقت تک وہ مغرب کا غلام ہے اور مستشرق کامیاب ہے۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کے آمرانہ نظام حکومت اور شہنشاہیت کی روایتی بے حسی نے مسلم ممالک کو مغرب سے آزادی حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس کے حقیقی ثمرات سے مستفیض نہ ہونے دیا اور آج کا مستشرق اتنا دیدہ دلیر ہے کہ اس نے

مسلمان کی بے حسی کو ماپنے کے بعد اب اپنی کاروائیوں پہ اخلاقی پردہ ڈالنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ آج ہم جس دور سے گزر رہیں ہیں اس میں مغرب کی طاقت اور مغرب کا مستشرق کھل کے مسلمان کے سامنے کھڑا ہے مگر مسلمان کی ہمت نہیں ہوتی کہ اسے للکار سکے۔ ان دنوں روز پاکستان کی آزادی اور خودمختاری کو پامال کیا جاتا ہے۔ روز ہمارے قبائلی علاقوں میں بے گناہ خون بہتا ہے مگر پوری دنیا اور خاص کر اسلامی دنیا میں کوئی آواز ایسی نہیں جو اس ظلم کی مذمت میں چار لفظ ہی اپنی زبان پہ لا سکے۔ آج کا مستشرق اپنے ہاتھ میں ہتھیار سجائے اسلام کے شجرہ طیبہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش میں مصروف عمل ہے۔

سارا مغرب اس کی پشت پہ ہے اور وہ اس شمع کو گل کرنے کی کوشش میں ہے جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے روشن کیا۔ مسلمان کو تلوار اور قلم سے گھائل کرنے کی کوششیں اگرچہ پندرہ صدیوں سے جاری ہیں مگر خدا کی قدرت ہے کہ منزل اہل مغرب کے قریب سے گذر جاتی ہے اور مسلمان پھر سے اپنے مرکز کی طرف لوٹ آتا ہے۔ آج بھی کوئی گیلپ سروے کیا جائے تو اٹھانوے فیصد مسلمان اپنے عقائد اپنی تہذیب اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ مغرب کبھی اس شمع کو گل کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہو سکے جو اس کے مستشرق کا صدیوں پرانا خواب ہے۔ مایوسی کی اس لیے کوئی ضرورت نہیں کہ اللہ نے خود اپنی کتاب میں مسلمان کو یہ خوشخبری دے رکھی ہے کہ کوئی طاقت اسلام کی شمع کو گل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الحجر 9/15)

ترجمہ؛

''بے شک ہم نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں''

****

چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں ہی بہت سے مسلم ممالک میں اسلامی تحریکیں زور پکڑنے لگیں۔ ہندوستان کی تقسیم بھی ایک ایسی ہی تحریک کا ردعمل تھا جس کے نتیجے میں پاکستان کا وجود اسلامی دنیا میں نمودار ہوا۔اس کے علاوہ بھی جو ممالک مغربی استعمار سے آزاد ہوئے وہاں کے لوگوں نے دین سے اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی حکومتوں پہ زور دیا کہ وہاں دین اسلام کے مطابق نظام حکومت قائم کیا جائے۔مصر اور افریقہ کے کئی ممالک اس کی روشن مثال ہیں۔

تاہم افغانستان اور ایران اپنے دوسرے بھائیوں سے قدرے آگے رہے اور ان ممالک میں اسلامی نظام حکومت قائم ہوا۔مگر مستشرق کے لیے یہ لحہ موت کے لمحے سے کم نہ تھا۔چنانچہ اس نے 9/11 کا ڈرامہ کھیلا اور افغانستان اور اس کے بعد عراق کو تباہ کر کے رکھ دیا۔چونکہ طاقت کا توازن ان کے حق میں تھا اس لیے وقتی طور پہ یہ مسلم ممالک مغلوب ہوئے۔مگر پھر فوراً ہی سنبھل گئے اور ان دونوں ممالک میں شدید مزاحمت نے جنم لیا اور آج جب اس حملے کو سات سال بیت چکے ہیں پوری دنیا جانتی ہے کہ امریکہ اور مغرب کو وہاں ناکامی کا سامنا ہے۔آج فرانس،اسپین،اٹلی،جاپان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ خود امریکی عوام نے بھی ان حکمرانوں کو ان کے گھر بھیج کر یہ ثابت کر دیا کہ امریکہ اور مغرب کی پالیسی ناقص اور عمل گیا گذرا تھا جس نے صرف انسانی خون بہایا اور اس سے انسانیت یا مغرب کسی بھی طرح کا کوئی مفاد حاصل نہیں کر سکا۔ملت اسلامیہ میں اسلام پسند قوتیں زور پکڑ رہیں تھیں اور یہ حالات مغربی مستشرق کے لیے پریشان کن تھے۔چنانچہ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے مغرب کی سیاسی اور عسکری طاقتوں نے مستشرقین کو نیا لائحہ عمل مرتب کرنے کا حکم دیا کہ ملت اسلامیہ کا یہ نیا رجحان مغرب کے لیے ایک ایسا خطرہ بنتا جا رہا تھا جس کی زد میں براہ راست اسرائیل کی وہ ناجائز ریاست بھی آتی تھی جس کے قیام کا مقصد ہی صرف اور صرف مسلمانوں کے سینے پر مونگ دلنا تھا۔

چنانچہ مسلمانوں کی ملی بیداری سے یہ صیہونی ریاست تباہ ہو کے رہ جاتی۔اس موقع پہ مستشرقین ایک مرتبہ پھر استشراقی،صیہونی،تبشیری اور استعماری آرزوؤں کے محل کی حفاظت کے لیے میدان میں آ گئے اور انھوں نے مسلمانوں کے لیے دہشت گردی اور بنیاد پرستی کی نئی اصطلاحات متعارف

کرائیں۔الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اس کی اتنی تشہیر کی گئی کہ مسلمانوں کا ایک گروہ بھی ان کا ہمنوا ہو گیا حالانکہ دنیا کے کسی معروف پلیٹ فارم سے آج تک ان حدود کا کوئی تعین نہیں کیا گیا جن میں طاقت کے استعمال کو دہشت گردی قرار دیا جا سکے۔مسلمان کچھ تو پہلے ہی اہل مغرب کی سیاسی عسکری اور معاشی برتری کے مقابل ایک خودساختہ احساس کمتری کا شکار ہیں۔اس لیے آج بہت سے مسلمان اس امر پہ شرمندہ سے نظر آتے ہیں کہ وہ مسلمان کیوں ہیں۔مگر وہ لوگ یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں کہ دنیا کے چالیس ممالک اپنی فوجی طاقت جمع کر کے افغانستان پہ حملہ کرتے ہیں تو وہ دہشت گرد نہیں مہذب ہیں،عراق میں ایک ملین سے زیادہ لوگوں کا خون بہایا جاتا ہے جن میں تین لاکھ معصوم بچے شامل ہیں تو خون بہانے والے مہذب ٹھیرے اور جن کا خون بہتا رہا ان کا نام دہشت گرد ہے۔

اہل مغرب کا کیا عجیب معیارِ عدل ہے جس کو آج دنیا تہذیب کا گہوارہ کہتی ہے۔گذشتہ بیس سال میں مسلمان کا جتنا خون اس دھرتی پر بہا ہے اس کا ذمہ دار جہاں مغرب کا مستشرق ہے وہیں مشرق کا حکمران طبقہ بھی ہے انشاءاللہ روزِ محشر وہ انھیں کے ساتھ اٹھے گا جن کا ساتھ انھوں نے اس دنیا میں ساتھ دیا۔آج کشمیر لہولہان ہے تو بوسنیا کے زخم بھی ابھی تازہ ہیں،افغانستان لہولہو ہے تو عراق میں بھی بہتے خون کی بے انتہا فراوانی ہے،فلسطین زخم زخم ہے تو شام اور لیبیا بھی اپنے لاشے اٹھانے کے لیے تیار رہیں،پاکستان کا شمال قطرہ قطرہ لہو کا خراج مانگ رہا ہے اور خود اپنی ہی افواج سے برسر پیکار ہے تو الجزائر میں بھی خون بہتا رہے گا،اِک تسلسل ہے خون کی ایک باڑ ہے لہو رنگ رت کے آثار ہیں جو سارے عالم اسلام پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔

اگر مصر میں اسلام پسند دین حق کے شجر کی آبیاری اپنے لہو سے کر رہے ہیں تو پاکستان میں لال مسجد [5*] کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کی روحیں بھی ان حکمرانوں کو چین نہ لینے دیں گی جو مستشرق کے ہاتھوں کا کھلونا بنے۔ان کو حساب دینا ہوگا آج بھی اور کل بھی،مغرب کا مستشرق یہ جان لے کہ یہ شمع کبھی بجھنے والی نہیں،ان کی قوتیں اس پتھر سے سر ٹکرا کر خود ہی پاش پاش ہو جائیں گی۔اسلام کی حقانیت اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی موجودگی میں مسلمان کا دو فیصد طبقہ جو مغرب کی

غلیظ پالیسیوں کا حصہ ہے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ تاریخ اس بات پہ گواہ ہے کہ اسلام ہی ایک زندہ مذہب ہے اور کسی زندہ مذہب کے پیروؤں کو سطحی ہتھکنڈوں سے اپنے نظریات ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس قوم کے لیے مایوس ہونے کا کیا جواز ہے جس کو محمد رسول اللہ ﷺ نے بشارت دے دی ہو کہ بڑی جنگ میں اسی کو فتح ہوگی۔ شام اور فلسطین کے پتھر بولیں گے دیواریں بولیں گی، درخت بولیں گے چھتیں بولیں گی، دلان بولیں گے کہ: اے مسلمان میرے پیچھے ایک یہودی چھپا ہوا ہے اس کو پکڑ اور قتل کر، الحمدوللہ



مستشرق کی اقسام

صدیوں پہ محیط مستشرق کی تاریخ مختلف مذاہب اور نظریات پہ عمل کرنے والے لوگوں پہ مشتمل رہی ہے اس لیے ضروری تھا کہ حالات کے ساتھ مستشرق کا طریقہ کار اور مقاصد بھی بدلتے رہیں۔اس لیے ہر زمانے میں مستشرق اپنا چولا بدلتا رہا۔کل اگر وہ سفید لبادہ پہنے لوگوں کا مفت علاج کر رہا تھا تو آج دنیا کو دہشت گردی سے آزاد کرانے کا عزم لیے اسلام کی بنیادوں پر حملہ آور ہے۔یاد رہے اس ہمہ پہلو تحریک کے دامن میں کئی اچھے کام بھی موجود ہیں جو بری نیت سے کیے گئے اور اچھے مستشرق بھی موجود رہے ہیں جنھوں نے علمی سطح پر گراں قدر خدمات سرانجام دیں ہیں۔تاہم ان کی اکثریت نے بنی نوع انسان کو فکری بے اعتدالی، نظریاتی بے راہ روی اور مادیت کے تحفوں ہی سے نوازا ہے۔ اسلام کے خلاف اس کھلے محاذ کو مستشرق نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔یعنی استشراق، تبشیر اور استعمار۔عمومی تاثر یہ ہے کہ یہ تین مختلف تنظیمیں ہیں اور یہ سب اپنے اپنے دائرہ عمل میں مصروفِ کار

رہتی ہیں۔تاہم مغرب کے جارحانہ عمل اورعزائم نے اس تاثر کوزائل کر دیا ہے اوران تنظیموں کا باہمی تعلق اب کسی سے چھپا ہوانہیں۔ان کا دائرہ عمل اگر چہ مختلف ہے مگران کا باہمی ارتباط ان کے مقاصد میں اشتراک کوظاہر کرتا ہے۔مبشرین وہ ہیں جنہوں نے عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنارکھا ہے۔ان کا سب سے اہم کام اسلام کے مقابلے میں عیسائیت کی حقانیت کو ثابت کرنا ہے ان کا میدان سراسر علمی ہے چنانچہ وہ علمی میدان میں اپنے افکار کا اندھیرا پھیلا رہے ہیں۔دوسرا گروہ استعمار پر مشتمل ہے جن میں مغربی سیاست دان سفارتکاراور فوجی حکمران شامل ہیں جن کا مقصد مشرقی ممالک پر استعماری غلبے کی کوششیں کرنا ہے۔جس میں گذشتہ صدیوں میں انھوں نے کافی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں اور جو لوگ علم اور انسانی خدمت کا لبادہ اوڑھ کر مصروفِ عمل ہیں وہ مستشرق کہلاتے ہیں اور ہم یہاں اسی گروہ اوران کی مختلف اقسام پر بحث کر رہے ہیں ان کو کئی مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن کی مختصر تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔



متعصب مستشرقین

یہودی اور عیسائی علماء نے روزِ اول سے اسلام دشمنی کو اپنا مقصد بنا رکھا ہے۔تحریکِ استشر اق کی تاریخ کے کسی بھی دور کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے مختلف طریقہ ہائے کار میں سے جس کا بھی تجزیہ کیا جائے وہاں متعصب یہودی اور عیسائی مختلف بھیسوں میں مصروفِ کار نظر آتے ہیں۔مستشرقین نے ہر محاذ سے اسلام پر حملے کیے ہیں جن کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ بیان کرنا مشکل ہے۔یوحنا دمشقی کی اسلام کے خلاف کتابیں قرطبہ کے شہیدوں کی پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کی منظّم تحریک ،پمپلونا کی خانقاہ میں لکھی جانے والی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضی سوانح عمری جس نے قرونِ وسطیٰ کے مستشرقین کو توہین رسالت کے لیے بنیادی مواد فراہم کیا۔پطرس محترم کی نگرانی میں ہونے والا ترجمہ قرآن جس میں مستشرقین نے اپنی علمی بدیانتی کے وہ نشان چھوڑے ہیں جن پہ آج کا مستشرق شرمندہ نظر آتا ہے۔علوم اسلامیہ کو یورپ کی زبانوں میں منتقل کرنے کی تحریک بھی اٹھی

مستشرقین نے شروع کی تھی تا کہ وہ اسلام پہ تنقید کے نئے پہلو تلاش کر سکیں ۔پھر صلیبی جنگوں کا مہیب سلسلہ ہے جو مستشرقین کی کوششوں کا ہی ثمر تھا۔اگر چہ وہ ثمر ان کے لیے اتنا کڑوا ثابت ہوا کہ وہ اصلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں اپنے مقدس مقامات تک کھو بیٹھے۔قرآنِ حکیم کی حیثیت میں تشکیک پیدا کرنا، ذخیرہ احادیث کے بارے میں لوگوں کے اذہان میں شکوک وشبہات پیدا کرنا مسلمان کے دلوں سے اسلام کی محبت کو کم کرنا، اگر مسلمان عیسائی بننے پر آمادہ نہ ہوں تو ان کو اپنے دین سے بیگانہ کرنے کی کوششیں، اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پہ بے بنیاد حملے، مستشرقین کی ان تمام کوششوں کے پیچھے عیسائی راہبوں پادریوں اور یہودی علماء کا ہاتھ نظر آتا ہے جن کے ذہن مذہبی تعصب کی آگ میں جل رہے تھے اور تعصب کوئی سا بھی ہو انسان کو اندھا کر کے چھوڑتا ہے اور اس کو حق کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا چاہے وہ سورج کی طرح ہی عیاں اور روشن کیوں نہ ہو۔

میرے پیشِ نظر ان کے خبث باطن کی غماز بہت سی تحریریں ہیں جنہیں تحریر کرنے کو جی نہیں چاہتا۔اس لیے کہ کیچڑ میں اترنے سے گندگی اور بدبو کے سوا حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔بس ان کا حال ایسا سمجھ لیں جو آسمان پر تھوکنے والوں کا ہوا کرتا ہے۔اگر چہ ان کے دماغ میں اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہر لحہ آگ سلگتی رہتی ہے مگر ان کو کم ہی مواقع نصیب ہوتے ہیں جب وہ اللہ کے دین کے خلاف کوئی دلیل لا سکیں۔اس لیے مجھے نہیں یاد پڑتا کہ مستشرقین کی پوری تاریخ میں وہ کسی راسخ العقیدہ مسلمان کو راہ سے بھٹکانے میں کامیاب ہوئے ہوں۔نظریاتی اور عقائدی محاذ پر قادیانیت کو ان کی بڑی کامیابی قرار دیا جا سکتا ہے اگر چہ مسلمانوں نے ان کو جب اپنے وجود سے کاٹ کر پرے پھینک دیا تو ان کی یہ کوشش بھی رائیگاں ہو کے رہ گئی۔اسلام نے یہود و نصاریٰ کو ہر میدان میں شکستیں دیں ہیں۔

عسکری لحاظ سے وہ کبھی بھی مسلمانوں کی ہم سری کا دعویٰ نہ کر سکے۔آج بھی جہاں مٹھی بھر راسخ العقیدہ مسلمانوں کا سامنا ان کی جدید ہتھیاروں سے لیس افواج سے ہوتا ہے تو اللہ کے فضل و کرم سے مسلمان کی برتری واضح نظر آتی ہے۔جیسا کہ چند سال قبل عرب شیخ حسن نصر اللہ کے چند ہزار

جانبازوں نے اسرائیل کی جدید ہتھیاروں سے لیس فوج کوناکوں چنے چبوا دیئے اور اس دنیا کے مہیب اتحاد نیٹو کو افغانستان میں مٹھی بھر طالبان نے گھیر رکھا ہے اور دنیا کو بتا دیا ہے کہ آج بھی مسلمان سے لڑنا ممکن نہیں۔ اگرچہ ہمارے حکمرانوں کا رویہ اسلام پسندوں اور اسلامی تحریکوں سے مستشرقین جیسا ہی ہے اس لیے کہ اسلامی دنیا میں دور دور تک کوئی ایسا حکمران نظر نہیں آتا جو حقیقی معنوں میں اسلام سے سچی محبت کرنے والا ہو اور یہی امت کے پارہ پارہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ مستشرقین نے دین اسلام پہ جو حملے کیے ہیں ان کا عکس مسلمانوں کے گمراہ فرقوں کی تحریریں فراہم کرتی ہیں ان کو اپنے مطلب کی کچھ موضوع احادیث مل جائیں تو وہ ان کی طرف جھپٹتے ہیں اور پھر ان کو بنیاد بنا کر وہ اپنے تخیل کے زور سے اسلام کو بدنام کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور تاثر یہ دیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے لیے ان کے پاس بڑے معتبر دلائل ہیں۔ وہ ان بے بنیاد دلائل کے مقابلے میں قرآن حکیم کی نصوص معتبر احادیث اور مسلم علماء کے اقوال کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مستشرقین کے اس طبقے نے جو رویہ اپنایا ہے اس کے اسباب تاریخی ہیں وہ اس روز سے اسلام کے خلاف اپنے دل میں زہر محسوس کرتے ہیں۔ جب ان کو جزیرہ عرب سے بے دخل کیا گیا تھا اور وہ نسل در نسل اس زہر کو اپنی نسلوں میں منتقل کرتے رہے ہیں۔ خطہ عرب میں عیسائیت اور یہودیت کے پھیلنے اور بڑھنے کے بھرپور امکانات موجود تھے جس کو اسلام کی آمد نے ختم کر دیا۔ پھر بت پرستوں کے مقابلے میں اہل کتاب ہونے کی وجہ سے یہود و نصاریٰ کو جو سماجی برتری حاصل تھی اسلام نے اس کو بھی ختم کر دیا اس لیے کہ تمام بت پرستوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

اہل کتاب کے علماء اور راہب عرب معاشرے میں سماجی برتری اور مادی تعیش کی زندگی گذار رہے تھے مگر اسلام کی آمد نے ان کو نہ صرف تنگ دست کر دیا بلکہ اپنی ناروا حرکتوں کی وجہ سے بالآخران کو جزیرہ عرب سے نکال باہر کیا گیا۔ چنانچہ اہل کتاب اپنے دل میں اسلام کے خلاف نفرت پالتے رہے جس نے گذرتے وقت کے ساتھ تحریک استشراق کا روپ دھار لیا اسلام اور اس کے پیروؤں نے ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جس کو اہل کتاب نے رد کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام

نے نہ صرف عرب وحجاز میں یہود ونصاریٰ کا وقار ختم کیا بلکہ ان سے کئی ممالک بھی چھین لیے گئے اور ان کی بہت بڑی اکثریت نے بھی اسلام قبول کرلیا جس کی وجہ سے یہود ونصاریٰ کے علماء کے سینوں میں اسلام کے خلاف بغض کی آگ بڑھکنے لگی ۔ اہل کتاب اور مستشرقین کی مسلسل ناکامیوں نے اسلام دشمنی کے اس پودے کو تناور درخت بنا دیا جس کا بیج طلوع اسلام کے ساتھ ہی ان کے دلوں میں بو دیا گیا تھا ان کے حسد کینہ بغض اور سفلہ پن کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب اسلام اس رنگ میں جلوہ گر ہوا جس کو پروردگارِ عالم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ○ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ ابراھیم 14/ آیات 24،25)

ترجمہ:

''آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں اور وہ دے رہا ہے اپنا پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم سے اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ انہیں خوب ذہن نشین کرلیں''۔

****

پھر ان مستشرقین کی آنکھوں کے خواب ایک ایک کر کے ٹوٹتے رہے اور انھوں نے دیکھا کہ اسلام نے ان سے بیت المقدس کی سرزمین بھی چھین لی اور ان کے جھنڈے اسپین اور سسلی کے جزیروں پر بھی لہرانے لگے ہیں اسلام کی فوجیں جب یورپ کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں تو انھوں

نے اپنی صلیبیں گلے میں تلواریں ہاتھوں میں لیں اور مسلمانوں کے مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے مگر جلد ہی ان پہ انکشاف ہوا کہ وہ کبھی بھی عسکری میدانوں میں مسلمانوں کو شکست نہ دے سکیں گے صلیبی جنگوں میں مسلسل شکستوں کے بعد انھوں نے ہتھیار اپنے ہاتھ سے رکھ دیئے اور قلم کاغذ کے ذریعے اسلام کے خلاف مصروفِ عمل ہو گئے۔ جب ان کے زہریلے لٹریچر نے مسلمانوں کو اپنے دین سے بیگانہ کر دیا اور وہ کمزور ہو گئے تو یہی لوگ پھر عادل اور رحم دل حکمرانوں کے روپ میں اسلامی ممالک پر چھا گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو اپنے دین سے دور اور عیسائیت سے قریب کرنے کے لیے کتابیں لکھیں۔ مشن کے نام پر مشنری سکول اور کالج قائم کیے ہسپتال قائم کیے اور ان میں مریضوں کا مفت علاج کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ خیراتی ادارے اور تنظیمیں قائم کیں اور اپنے آپ کو دکھی انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد ظاہر کر کے دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ صرف ان کا دین ہی اپنے دامن میں دکھی انسانیت کے لیے نجات اور فلاح کی خوشخبری لے کر جلوہ گر ہوا ہے۔ انھوں نے ہسپتالوں میں مریضوں کی جسمانی بیماریوں کا علاج کیا مگر روحانی طور پہ ان کا اثاثہ چھین لیا۔ انھوں نے مشن سکولوں میں بچوں کو تعلیم دینے کے بھیس میں ایک ایسی نسل تیار کر دی جس کو اسلام سے واجبی سی دلچسپی بھی نہ تھی پھر انھی خاص لوگوں کو اپنے وسائل استعمال کرتے ہوئے ہم پہ حکمران بنا دیا ۔حقیقت یہ ہے مستشرقین کا یہ قافلہ کل بھی مصروفِ عمل تھا اور آج بھی اس کی سرگرمیاں جاری ہیں کبھی اس نے علانیہ اور کبھی خفیہ طور پہ زہر کا پیالا پلایا اور مسلمانوں کی سادہ دلی کے کیا کہنے کہ وہ یہ زہر پیتا ہی رہا۔



ملحد مستشرقین

کلیسا کے دورِ استبداد یعنی قرونِ وسطیٰ کے زمانے میں جب کلیسا اور سائنسی علوم میں زبردست محاذ آرائی بپا تھی اور کلیسا نے اپنی طاقت کے ذریعے اٹھنے والی ہر علمی آواز کو دبانے کا تہیہ کر رکھا تھا اس وقت عیسائیوں میں ایک ایسے طبقے نے جنم لیا جو صرف عیسائیت کے ہی خلاف نہ تھا بلکہ اس کے نزدیک تمام مذاہب خرافات کا پلندہ تھے ان کو ملحدین کہا جاتا ہے۔اس دور میں یورپ کا اقتدار عملاً کلیسا کے ہاتھ میں تھا اور وہ کوئی بھی ایسی آواز جو کلیسا کے معتقدات کے خلاف ہو اسے اٹھنے سے پہلے ہی دبا دیتے تھے۔مگر علم کی پیاس انسانی فطرت ہے اور انسان تہذیب کے کسی بھی دور میں علم سے دور نہ رہ سکا، چاہیے وہ کلیسا کا استبدادی دور ہی کیوں نہ ہو۔مگر علم کی پیاس رکھنے والے لوگوں کے ساتھ پاپائے روم نے جو سلوک روا رکھا ہوا تھا اسے ایک مغربی مورخ ڈاکٹر ڈریپر کچھ اس طرح

بیان کرتا ہے۔

"پاپائے روم کے ہاں ہر وہ عیسائی بھی کافر تھا جو کلیسائی ذہن سے بالاتر ہو کر سوچتا ہو علمی کتابیں لکھتا ہو یا سائنسی نظریات پیش کرتا ہو۔ مسلمان کی تہذیب یا ان سے وابستہ کسی اور بات کو اچھا سمجھتا ہو۔ چنانچہ ایسے کافروں کو سزا دینے کے لیے پاپائے روم نے 1478ء کو ایک مذہبی عدالت قائم کی جس نے اپنے قیام کے پہلے ہی سال دو ہزار علم پسند لوگوں کو زندہ آگ میں جلا دیا اور ستر ہزار کو قید و جرمانے کی سزائیں سنائیں۔ دس برس میں پوپ کی اس مذہبی عدالت نے سترہ ہزار افراد کو آگ میں پھنکوا دیا اور ایک لاکھ سے زائد افراد کو قید و بند کی سزا سنائی۔ اس کے ساتھ پوپ کے حواریوں نے اپنی علم دشمنی کی بنا پر مختلف علوم پہ مشتمل چھ ہزار کتابیں بھی نذرِ آتش کرا دیں۔ چنانچہ پوپ کی اس مرکزی عدالت نے صدیوں تک علم کے راستے کو روکے رکھا۔ مذہبی استبداد کا یہ نظام چار صدیوں تک یورپ پہ چھایا رہا جس میں بتیس ہزار سے زائد افراد لقمہ اجل بنے اور مجموعی طور پہ اس عدالت سے متاثر ہونے والے افراد کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے"۔

****

بالآخر لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انھوں نے علم کی ترقی کے لیے اپنا دامن مذہب سے مکمل طور پہ چھڑا لیا۔ یورپ میں ایک بڑی تحریک اٹھی جس نے کلیسا کے اس نظام جبر کو چیلنج کیا، ایک طوفان اٹھا جس کی رو میں جہاں کلیسا اور پوپ کا استبدادی نظام بہہ گیا۔ وہاں اہل مغرب کے ہاں مذہب سے ایسی کراہت کا تصور بھی پیدا ہوا جس کا عکس آج کے ہر مغربی معاشرے میں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے مذہب کو ایک گرجے میں محبوس کر دیا۔ جہاں اتوار کو چند بھولے بھٹکے بلکہ عمر

رسیدہ فارغ لوگ جمع ہو کر اپنی زندگی میں مذہب کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ عیسائیوں کی مذہب بیزاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانیہ جو عیسائیت کا مرکز و محور ہے وہاں گرجے اس بنیاد پر فروخت ہو رہے ہیں کہ لوگ ان کی طرف رخ ہی نہیں کرتے اور کوئی اس بڑی عمارت کا خرچ اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ وہاں کئی گرجوں کو مسلمانوں نے خرید کر مسجدوں میں بدل دیا ہے۔ چنانچہ اس صورت حال میں یورپ میں الحادی تحریک نے زور پکڑا اور اہل مغرب کی زندگی کا ہر شعبہ عملاً ان لوگوں کے قبضے میں چلا گیا جو عیسائی کہلاتے ہیں۔ مگر ان کی سوچ بھی ملحدانہ ہے اور ان کا عمل بھی اس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح یہ ملحد مستشرقین بھی استشراقی جدوجہد میں عیسائی راہبوں اور یہودی علماء کے شانہ بشانہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ اب چونکہ یہ ملحدین یورپی معاشروں کے شہری تھے اس لیے ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ مذہب کی براہ راست مخالفت کر سکیں اس لیے انہوں نے اپنے لیے آسان میدان کا انتخاب کیا اور اپنی مذہب بیزاری کے جذبات مسلمانوں پر نکالے۔ انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل تعلیمات اور تصورِ اسلام کی حقیقی ماہیت کو متاثر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان ملحدین کو تحریک استشراق کی شکل میں ایک ایسی آڑ میسر آ گئی جس کا سہارا لے کر انھوں نے اپنے مذہب بیزار تصورات کو معاشرے میں پھیلانا شروع کیا۔ مثال کے طور پہ صرف ایک ملحد مستشرق (Folatier) کے خیالات پیش کرتا ہوں۔

"فولٹیئر ایک ملحد مستشرق تھا وہ مذہب اور کلیسا کا زبردست مخالف تھا لیکن نہ تو وہ کھل کر بنی اسرائیل کے کسی نبی کی شان پر حملہ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا اور نہ ہی پوپ اور اس کی پالیسیوں کو براہ راست اپنی تنقید کا نشانہ بنا سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں اسے کلیسا کے عوام اور اپنی حکومت ہر طرف سے مخالفت کا خطرہ تھا اس مشکل کا حل اس نے یہ نکالا کہ اس نے تمام ادیان اور ان کے بانیوں پر کیچڑ اچھالنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو بطور رمز استعمال کیا۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ایسے

رکیک حملے کیے جس کی ہمت اس سے پہلے کسی اور مستشرق کو نہ ہوئی تھی۔فولٹیئر نہایت عیار مستشرق تھا اس لیے اس نے اگرچہ اپنی تحریروں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے مذاہب کی مقدس ہستیوں پر بھی کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے۔مگر چونکہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر یہ حملے کیے تھے اس لیے اس نے اپنے اس کارنامے پر پوپ کی خوشنودی یا کم ازکم اس کی ناراضگی سے بچنے کے لیے اپنی کتاب کا انتساب پوپ کے نام کردیا اس طرح اس عیار اور ملحد مستشرق نے کلیسا اور اسلام دونوں کے خلاف اپنا زہر بھی اگل دیا اور اسے کسی خطرے کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا''۔

****

فولٹیئر کے علاوہ بھی ملحد مستشرقین کی بہت بڑی تعداد تاریخ کے صفحوں میں بکھری پڑی ہے جنہوں نے مختلف اسلوب اختیار کرتے ہوئے مذاہبِ عالم کے خلاف اپنی بے زاری کا اظہار کیا ہے۔اول اول تو انھوں نے دستیاب وسائل کو ہی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور افسانے یا ناول کی شکل میں مشاہیر ادیان کی ہجو کرتے رہے۔پھر الیکٹرانک میڈیا کے آنے کے بعد انھوں نے اپنے دائرہ عمل کو وسعت دے دی اور اب سارا مغربی میڈیا بھی اپنی اسلام دشمنی اور کہیں کہیں تمام دینی تصورات پہ اپنا ذہنی غبار نکالتا رہتا ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ ہم انھیں اہل علم اور اپنا محسن جانتے ہیں۔اللہ ہم پہ رحم فرمائے۔آمین



علم پیشہ مستشرقین

دنیا کے ہر معاشرے میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا موجود ہوتا ہے جن کا دین اور ایمان پیسہ ہے اور پیسے کی خاطر وہ اپنا ایمان بھی بیچ سکتے ہیں اور کسی دوسرے کے ایمان پر تنقید بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مستشرقین کی تحریک میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جن کا مقصد صرف پیسہ کمانا تھا اور ایسے لوگوں کو علم پیشہ مستشرقین کہا جاتا ہے۔ مستشرقین کی تحریک کے تفصیلی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تحریک نے ہمیشہ تبشیر یا استعمار کی جانب سے ملنے والی امداد پر بھروسہ کیا ہے اور اس تحریک کے اندر بھی ایسے بہت سے لوگ شامل تھے جن کا مقصد سراسر سیاسی تھا۔ انھوں نے محض علمی لبادہ اوڑھ رکھا تھا ان لوگوں نے تحریکِ استشراق کو ایک پلیٹ فارم کے طور پہ استعمال کیا اور اپنے علمی ذرائع کو تبشیری اور استعماری طاقتوں کی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔ انھوں نے اپنی تحقیقات اور اسلام کے خلاف اپنی بے زاری کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ انعام کے طور پہ ان کو یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں تحقیقی

اداروں مجلوں اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن پہ بڑے بڑے عہدے ملے۔ مستشرقین کی اس جماعت میں سے چند لوگوں نے بہت ترقی کی اور انھوں نے حکومتی ایوانوں میں قابل ذکر عہدے حاصل کیئے اور مستعمرین اور مبشرین سے مل کر اسلام کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ تمام اہل مغرب خواہ وہ یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا ملحد ہوں ان کو اس امر خاص کا ادراک حاصل تھا کہ ان کے دینی سیاسی اور اقتصادی ایجنڈے کی تکمیل کی راہ میں اگر کوئی حقیقی رکاوٹ ہے تو وہ ہے مسلمان کا وجود اور ان کا نظریہ اسلام، چونکہ استعماری طاقتوں کی نظریں اسلامی ممالک کے وسائل پر تھیں اس لیے اس دور کا وہ مستشرق جس کے دل میں ایک تاجر کا دل تھا اچھی طرح جانتا تھا کہ جب تک امت مسلمہ کی دیوار ِان کی راہ میں حائل ہے اس وقت تک نہ تو ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ پاپائے روم کا اسلامی ممالک پر عیسائیت کا پرچم لہرانے کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان سب نے مل کر اسلام کی اس دیوار میں رخنے ڈالنے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ مغرب کے بنیئے نے ان کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے اور لاتعداد مدعیان علم دولت شہرت اور حشمت کی اس دیوی کی خاطر اسلام کی دیوار کو منہدم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

انھوں نے اسلامی ادب کے ذخیرے کو کھنگال ڈالا تا کہ ان کے ہاتھ کوئی ایسی چیز لگ جائے جس کی مدد سے وہ مسلمان کے کردار کو داغدار کر سکیں۔ انھوں نے ممالک اسلامیہ کے چپے چپے کو چھان مارا اور مسلم ممالک میں پھیلے بے پناہ قدرتی وسائل کی فہرستیں مرتب کیں۔ مسلمانوں کی ان خامیوں کو نوٹ کیا جن کے ذریعے وہ باہم ان کو لڑا کر اپنے مفادات حاصل کر سکتے تھے۔ چنانچہ پیشہ ور مستشرقین کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود تحریک استشراق قدیم اور طویل ہے۔ کبھی یہ طبقہ پاپائے روم کی اشیر باد حاصل کرنے کی جدو جہد میں مصروف رہا تو کبھی اپنی علم فروشی کے کارناموں پر انھوں نے مغربی حکمرانوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا اور کبھی انھوں نے ان تجارتی کمپنیوں کا رخ کیا جہاں ان کے دامنِ ہوس میں چند سکے ڈالے جا سکتے تھے۔ آج کے پیشہ ور مستشرق اور ضمیر فروش عالموں کی توجہات کا مرکز امریکہ ہے جہاں ان کو بے پناہ مالی وسائل کے عوض اسلام کو سرنگوں کرنے کی پالیسیاں وضع کرنا ہوتی ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اپنی تشنہ

خواہشوں کی اکثیر مسلمانوں کی ایک معقول تعداد بھی ان پیشہ ور مستشرقین کے کندھے سے کندھا ملا کر اپنے ہی نظریے اور عقائد پر کلہاڑا چلانے میں مصروف ہے۔اللہ ہم پہ رحم فرمائے۔



اہل علم مستشرقین

آج کا مسلم نوجوان اہل مغرب کی علمی برتری سے مرعوب ہے مگر ہمارا دانشوران کو یہ بتانے کے لیے تیار نہیں کہ اہل مغرب کا تمام علمی اثاثہ مشرق سے مستعار لیا ہوا ہے۔ جب مسلم دنیا باہمی نزاع اور قرآن سے دوری کی وجہ سے زوال کا شکار ہوئی اس وقت مغرب انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ چنانچہ جونہی اس کی آنکھیں پوری طرح کھلیں تو اس کے سامنے بے پناہ علمی ذخیرہ تھا جو مسلمان علماء کا مرتب کیا ہوا تھا۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جب مسلم ہسپانیہ سے علوم وفنون کی لہریں اٹھ کر ایک عالم کو بقعہ نور بنا رہی تھیں اس وقت یورپ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور سارے یورپ کا علمی اثاثہ صرف چند ہزار کتابیں تھیں اور ان کتابوں میں بھی شاید ہی کوئی علمی کتاب شامل ہو کیونکہ ان کے ہاں اس وقت صرف قصے کہانیوں اور دعاؤں کی کتابیں ہی پائی جاتی تھیں۔ جب کہ مسلمانوں کے ہاں علم ہیئت، ریاضی، جدلیات، ارضیات، نفسیات، طب اور علم الادیان پر سیر حاصل

کام ہو چکا تھا۔ دراصل بہت سے لوگ آج کے یورپ اور امریکہ کی کروڑوں کتابوں سے بھری ہوئی لائبریریوں سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اہل مغرب کی ترقی کا راز ان کے انھی علمی اثاثوں میں پوشیدہ ہے۔ اگر چہ یہ بات سچ ہے کہ یہی وہ کتابیں ہیں یہی وہ علم ہے جس نے اہل مغرب کی زندگی میں وہ معاشی سماجی سیاسی اور عسکری انقلاب بپا کیا جن سے آج خطہ ارض پہ بسنے والا ہر انسان مرعوب ہے۔

وہ نہیں جانتا کہ علم یورپ میں اسلام کے واسطے سے داخل ہوا اور علوم وفنون کا منبع مغرب سے نہیں بلکہ مشرق سے پھوٹا تھا اور آج کے اکثر علمی نظریات کی بنیاد ان مستشرقین نے ہی استوار کی تھی جنہوں نے مسلمانوں کے علمی اثاثے کو قیمتی جانتے ہوئے اس کو پہلے اپنی زبانوں میں منتقل کیا اور پھر اس کو اپنی آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا۔ اہل یورپ نے ابتدا میں علم کا راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ان میں ایک طبقہ مسلسل اس جدوجہد میں مصروف رہا کہ اپنی قوم کی علمی استعداد کو بڑھایا جائے اور مستشرقین میں سے صرف یہی ایک ایسا طبقہ تھا جن کے عزائم اور مقاصد سراسر علمی تھے ۔ چنانچہ مغرب کے جو اہل علم کلیسا اور بادشاہت کے متحدہ استبدادی نظام سے ٹکرائے ان میں سے اکثر مشرقی علماء کے شاگرد تھے۔

وہ لوگ جو کتابیں پڑھتے تھے جن کتابوں کے تراجم کرتے تھے اور جن کی بنیاد پر وہ نئی کتابیں تصنیف کرتے تھے وہ ساری اہل مشرق اور مسلمانوں کی تصنیفات تھیں۔ اس لیے یہ لوگ استشراق کی ہر تعریف کے لحاظ سے مستشرق تھے۔ آج تک مستشرقین کا یہ طبقہ مشرق کے چپے چپے کو چھاننے میں مصروف ہے۔ یہ لوگ کھدائیوں کے ذریعے عالم مشرق کے مختلف علاقوں میں آثارِ قدیمہ تلاش کرنے میں مصروف ہیں اور وہ بے پناہ علمی سرمایہ جس کو مسلمان نے اپنی نالائقی کی وجہ سے طاق نسیان کی زینت بنا دیا تھا مستشرقین کا یہ گروہ اس علمی سرمایے کی حفاظت اس کی ترتیب وتدوین اور اس کی اشاعت میں مصروف ہے جس کی تعریف نہ کرنا بخل کے زمرے میں آئے گا۔ اگر چہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کے علمی سرمایے کو مغرب میں منتقل کیا ان کے پیش نظر اپنے ہی قومی مفادات تھے اور وہ یورپ کو بھی علم کے انھی ہتھیاروں سے لیس کرنا چاہتے تھے جن کے

بل بوتے پر مسلمانوں نے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو زیر کیا تھا۔ مستشرقین کا یہ طبقہ اگرچہ علم دوست تھا مگر پھر بھی ان کی یہ علمی بددیانتی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے علوم سے فائدہ اٹھایا اور اپنی تمدنی تعمیر کی مگر اس کے باوجود ان کا عمومی پروپیگنڈہ یہ ہے کہ انسانیت کی موجودہ ترقی میں مسلمانوں کا کوئی ہاتھ نہیں۔

چنانچہ پروفیسر اشفاق علی خان اپنی کتاب ”**یورپ پر اسلام کے احسانات**“ میں لکھتے ہیں کہ:

”آج جن کتابوں کا ایک بے پناہ طوفان مغرب سے اٹھ کر مشرق کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے ان میں سے کوئی یہ نہیں بتاتی کہ وہ راجر بیکن جسے انگلستان میں بابائے سائنس کہا جاتا ہے وہ عربوں کا شاگرد تھا۔ وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتا کہ علم حاصل کرنا ہے تو عربی سیکھو۔ مورخین مغرب یونانیوں کو علم کا سرچشمہ بتاتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان کی کتابیں چھ سو برس تک ایتھنز اسکندریہ اور قسطنطینہ میں مقفل پڑی رہیں اور یہ عرب ہی تھے جنھوں نے ان کو نکالا ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا اور یہی تراجم مسلمانوں کے ساتھ یورپ پہنچے۔ یورپ میں سائنس اڑھائی سو برس میں اسحاق نیوٹن سے آئن سٹائن تک جا پہنچی لیکن عربوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہزار سال تک یونانیوں کا ترجمہ ہی کرتے رہے اور انھوں نے علوم فنون میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں کیا۔ چنانچہ آج کے یہودی اور عیسائی مورخ اسلامی علوم وفنون کا ذکر تک نہیں کرتے اور نہ دنیا کو یہ بتانے کے روادار ہیں کہ گلیلو، کپلر، برونو، جیراڈ، اور راجر بیکن عربوں کے نقال تھے اور ہمارے مدارس کے بچوں کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ امریکہ کولمبس نے اور افریقہ لونگ سٹون نے دریافت کیا مگر ان بچوں کو یہ نہیں بتایا جاتا کہ کولمبس نے بحر پیمائی کی تعلیم اسلامی درس گاہوں میں حاصل کی تھی اور ہندوستان کی تلاش کی مہم جس کے نتیجے میں امریکہ دریافت ہوا کولمبس کے پاس جو کمپاس تھا وہ عربوں ہی کی ایجاد تھا اور اپنے بحری سفروں میں

راہنمائی کے لیے وہ جن نقشوں کو استعمال کیا کرتا وہ مسلمان ملاحوں کے ہی مرتب شدہ تھے"۔



معتدل مستشرقین

سولھویں صدی کے آخر میں کچھ ایسے مستشرقین پیدا ہوئے جنھوں نے تحریکِ استشراق کے بنیادی اسلوب سے بغاوت کی راہ پنائی اور مستشرقین جو صدیوں سے اسلام اور تصورِ اسلام کو مسخ کرنے میں مصروف تھے۔اس کا ردِعمل بھی خود اس تحریک کے اندر سے آیا۔مستشرقین کے اس طبقے نے کلیسا کی اندھی تقلید کا پٹہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکا اور صدیوں سے مروّج روایات کو عقل سے پرکھنے کی بنا ڈالی۔انھوں نے عیسائیت کو بھی تنقید کی نگاہ سے دیکھا اور پاپائے روم کے اختیارات کو چیلنج کیا جس سے معاشرے میں ایک مثبت طرزِ عمل نے جنم لیا اور کچھ مستشرقین نے اسلام کے رُخِ زیبا پر پڑے ہوئے شکوک وشبہات کے اندر سے دین اسلام کی حقیقی ماہیت کو کھوجنے کی کوشش کی تب وہ اپنے سابقہ ادوار کے مستشرقین کے رویے پہ شرمندہ ہو گئے اور انھوں نے ان علمی بددیانتیوں کی نشاندہی کی جو اسلام کے بارے میں ان کے پیش رو کر چکے تھے۔تاہم یاد رہے کہ مستشرقین کے اس

طبقے کا تعلق بھی مغرب سے تھا اور ان کا دین بھی عیسائیت تھا۔اس لیے ان کی تحریروں میں اسلام کے متعلق اس وارفتگی اور محبت کو تلاش کرنا جس کی توقع کسی مسلم مورخ سے کی جاسکتی ہے عبث ہے۔ان کی تحریروں میں قدرتی طور پر کچھ روکھا پن پایا جاتا ہے اگر چہ وہ حقائق کو چھپانے یا مسخ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

وہ اقوام مشرق کا مطالعہ اور تجزیہ ان پیمانوں سے کرتے ہیں جو مغرب میں رائج ہیں اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان پہ اپنے ہی مذہب کا غلبہ ہوتا ہے اس لیے کسی بھی مغربی مستشرق سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو بالکل اسی نظر سے دیکھیں جس نظر سے ہم دیکھتے ہیں۔اس لیے مستشرقین کے اس طبقے میں بھی بے شمار کوتاہیاں موجود ہیں اور ان کی تحریروں میں بھی بہت سی ایسی غلطیاں شامل ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے کہ ان کے مآخذ تو آخر وہی ہیں جو ان کے پیش رو چھوڑ گئے تھے اور ان کے پیش نظر وہی تراجم ہیں جو مستشرقین نے کیے تھے ۔اس لیے لامحالہ ان کی تحریروں میں بھی بہت سی ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جن کو حق اور انصاف قرار نہیں دیا جاسکتا۔

تاہم ان مستشرقین کا مجموعی اندازِ تحریر ایسا ہے کہ ان کو معتدل مستشرقین کہا جاسکتا ہے۔اس لیے کہ وہ ارادتاً نہ تو اسلام کے اصل تصور کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بہتان باندھتے ہیں۔مستشرقین کے اس گروہ نے جب اسلام کو نگاہ عدل سے دیکھا تو انھوں نے اس کے متعلق مثبت رویہ اپنایا اس لیے کہ مستشرقین کے اس طبقے میں شامل کثیر تعداد ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اپنے اسلاف کے رویہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ ان کو یقین تھا کہ ذہنی بیداری کے اس دور میں اب اسلام کی حقانیت کو مزید مسخ نہیں کیا جاسکتا۔

انھوں نے اپنے اسلاف کے علمی رویہ پر بھی شدید تنقید کی ہے۔تاہم معتدل مستشرقین کے اس گروہ میں بھی بہت سے ایسے لوگ شامل ہیں جنھوں نے اگر چہ اسلام کے بارے میں معتدل رویہ اختیار کیا تاہم ان میں شامل چند افراد خود کو اپنے پیش رووں کے اسلوب سے نہ بچا سکے۔معتدل مستشرقین کے اس گروہ میں دیگر علماء کے علاوہ رچرڈ سائمن، پیئر بائیل، سائمن او کلے، ہادیان

رینالڈ، یوھان، جے رسکے، مائیکل ایچ ہارٹ، ڈاکٹر مورس بکائلے، تھامس کارلائل، لارمانتین، پروفیسر لیک، پروفیسر آرنلڈ اور جارج برنارڈ شاہ جیسے لوگ شامل ہیں۔



آئندہ صفحات میں کچھ اُن شاہ بختوں کا تذکرہ ہے جو
مستشرقین کے قبیلے سے ہیں، وہ انھیں مقاصد کو لے کر علم
کی وادی میں اترے جو اس تحریک کا خاصا تھا مگر جب
قرآن کی لہریں اُن کے دل سے ٹکرائیں تو اسے قرار آ گیا
اور وہ اس کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔

قافلہ نورحق

مستشرقین کے قافلہ سے اب ان خوش نصیبوں کا احوال بیان کیا جاتا ہے جنہوں نے دنیاوی مفاد اور دنیا کی ملامت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے اندر کی آواز پہ کان دھرے اور وہ قافلہ نورِحق کے ہمراہ ہو گئے۔ اسلام آج کی دنیا میں تیزی سے پھیلتا ہوا مذہب ہے۔ اس لیے کہ کسی اور مذہب کی تعلیمات میں وہ جاذبیت اور امن وسلامتی کی وہ دعوت پائی ہی نہیں جاتی جو کسی حق کے متلاشی کے دل پہ شب خون مار سکے۔ اس لیے مستشرقین کے قافلے کے بھی بہت سے لوگ اپنے دل میں کھوٹ لیے علم کی اس وادی میں اترے مگر فلاح کے موتی لے کر لوٹے۔ اپنے دل کو اسلام کی روشنی سے منور کرنے والے مستشرقین کی تاریخ اور تفصیل ایک طویل داستان کی طرح ہے اس لیے ہم اختصار کا راستہ اختیار کریں گے اور بطور تبرک ہم چیدہ چیدہ مستشرقین کا احوال بیان کریں گے جن کی کوئی ادا خالق کو بھا گئی جن کا کوئی لمحہ یقیناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت میں گذرا جس کا صلہ ان کو ایمان

کی لازوال دولت کی شکل میں لوٹایا گیا۔اللہ ان پہ بھی اپنا رحم فرمائے اور ہمیں بھی ہدایت سے نوازے۔



علی عمر کریم

علامہ زکریاہاشم زکریا نے مستشرقین کے اس گروہ کا ذکراپنی کتاب ''**المستشرقون و اسلام**'' میں کیا ہے جو 1968ء میں ریاض سعودی عرب سے شائع ہوئی۔ڈاکٹر ارتھرکین کا تعلق امریکہ سے ہے۔اسلام قبول کرنے کے بعدانھوں نے اپنے لیے علی عمر کریم کے نام کو پسند کیا۔ان کے قبول اسلام کی تفصیلات خودانھی کی زبانی سنیں۔

''بیس سال کی عمر تک میرا خدا پرایمان نہ تھا۔اگرچہ میرا سارا گھرانہ مذہبی تھا اس لیے ان کا دل رکھنے کے لیے میں کبھی کبھار چرچ جایا کرتا لیکن میرے ذہن میں مادے کے سوا کسی چیز کی ہوس نہ تھی اور میری زندگی روحانی عنصر سے بالکل بے بہرہ تھی۔ایک وقت آیا کہ مجھے اپنی زندگی کے متعلق بے چینی ہونے لگی تب جانے کہاں سے اڑتا ہوا کاغذ کا ایک

پرزہ میرے ہاتھ آیا جس پہ کچھ لکھا تھا۔ابتدا میں مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ اس کاغذ پہ کیا لکھا ہے۔میرے گھر والے مذہبی لوگ تھے انھوں نے اس کاغذ کو میرے ہاتھ میں دیکھا تو سخت ناراض ہوئے۔انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ مسلمانوں کی مقدس کتاب کے اوراق کا ایک حصہ ہے۔میں نے عبارت پرغور کیا تو مجھے اپنی بے چینی میں کچھ کمی سی محسوس ہوئی۔ چنانچہ میں اسے گھر والوں سے چھپالیا اور اپنے رویے کو بھی درست کرلیا تا کہ کوئی مجھ پہ شک نہ کرے۔

ہمارے گھر کے قریب ایک بہت بڑی لائبریری تھی میں نے وہاں جانا شروع کر دیا اور لگا تار مختلف ادیان کا تقابلی مطالعہ شروع کر دیا۔میں نے محسوس کیا کہ تمام مذاہب کچھ نہ کچھ حق بیان کرتے ہیں لیکن اسلام مکمل حق بیان کرتا ہے۔اسلام کی تعلیمات میں مجھے صراحت عظمت برتری اور عظیم روحانیت نظر آئی۔ میں دس سال تک تقابل مذاہب کا طالب علم رہا لیکن ہر گذرتے دن نے مجھے اسلام کی طرف ہی جھکایا۔ایک دن میں ایک مسجد کے پاس سے گذرا میں وہاں ٹھہر گیا لوگوں کو عبادت کرتے دیکھتا رہا۔مجھے اپنے اندر بڑی بے چینی محسوس ہوئی میرا دل چاہتا تھا کہ میں ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں اعتقادی طور پہ تو میں جانے کب سے پکا مسلمان بن چکا تھا تاہم اس روز میں نے ارادہ کیا کہ آج مجھے عملی طور پہ بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جانا چاہیے۔

چنانچہ جونہی وہ لوگ نیویارک کی اس مسجد سے باہر نکلے میں اندر داخل ہو گیا۔امام صاحب مجھے بڑی محبت سے ملے اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی انہوں نے مجھے اسلام کی دعوت دی۔میں نے جب ان کو بتایا کہ میں اسی ارادے سے مسجد میں داخل ہوا ہوں تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔انھوں نے مجھے کلمہ توحید پڑھایا اور مجھے سینے سے لگا لیا۔میں نے ان سے پوچھا کہ اگلی عبادت میں کتنا وقت ہے تو انھوں نے کہا کہ زیادہ وقت نہیں ہے آؤ باتیں کرتے ہیں تھوڑی دیر بعد نماز مغرب کا وقت ہو گیا اور میں نے اپنی زندگی کی پہلی نماز پڑھی جس کا لطف آج تک میری رگوں میں دوڑتا ہے۔اللہ نے مجھے ایمان کی

نعمت سے نواز کر مجھ پہ احسان عظیم کیا ہے"۔



ابوبکر سراج

ڈاکٹر مارٹن لنگز برطانیہ کے مشہور مستشرق تھے. اللہ نے انھیں ایمان کی لازوال نعمت سے نوازا۔ قبول اسلام کے بعد انھوں نے اپنا نام ابوبکر سراج رکھا۔ ڈاکٹر ابوبکر سراج مصر یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کے ڈین تھے۔ بعد میں برٹش میوزم لائبریری کے سربراہ کی حیثیت سے بھی خدمات سر انجام دیتے رہے۔ یہاں انھوں نے اسلام کی تعلیمات کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اسلام کا دوسرے ادیان سے تقابلی جائزہ لیا۔ اسلامی تصوف ان کے مطالعے کا محور تھا جس سے وہ بہت متاثر تھے۔ آخر قسمت نے یاوری کی اور بقول علامہ زکریا ہاشم زکریا وہ تصوف کی سیڑھی کے ذریعے خدا تک جا پہنچے۔ بعد میں انھوں نے تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کرنا شروع کر دیا اور اپنی باقی ساری زندگی وہ

دین اسلام کی دعوت دینے اور اسلام کی سربلندی پہ جدلیاتی پہلو سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔



عبداللہ بن عبداللہ

عبداللہ بن عبداللہ مستشرقین کی تحریک میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔وہ جزیرہ میورقہ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔زندگی کا طویل حصہ عیسائیت کی تبلیغ واشاعت میں گذرا۔ان کے گھر والے چاہتے تھے کہ وہ بڑے ہوکر عیسائیت میں نام پیدا کریں اور پادری بنیں۔اس لیے زندگی کا ابتدائی حصہ انہوں نے ایک پادری کی خدمت میں گذارا جہاں وہ دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے ۔پادری کو اپنے اس شاگرد پر بڑا ناز تھا اس لیے گرجے کی چابیاں جناب عبداللہ کے پاس ہی ہوا کرتیں۔ایک دن کا ذکر ہے کہ کسی وجہ سے بڑا پادری اپنی درس گاہ نہ جاسکا اس کی عدم موجودگی میں اس کے شاگرد دیر تک حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کے اس قول پہ بحث کرتے رہے کہ "میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام فارقلیط ہوگا" کچھ دن بعد جناب عبداللہ نے اپنے استاد پادری سے جناب فارقلیط کے بارے میں اصرار سے دریافت کیا۔جناب عبداللہ کا استاد پادری رونے لگا۔شاگرد نے

کہا کہ جہاں آپ نے مجھے اتنے علم سے نوازا ہے وہیں اس فارقلیط والے معاملے میں بھی میری راہنمائی فرمائیں۔استاد نے کہا کہ مجھے خوف ہے کہ اس کے بعد عیسائی تجھے مار ڈالیں گے۔اگر چہ میری خواہش ہے کہ تم کو ان کے بارے میں بتاؤں۔شاگرد نے استاد سے کڑی رازداری کا وعدہ کیا تو استاد نے ان کو بتا دیا کہ فارقلیط محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا نام ہے۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب یقیناً سچا ہے اور اگر اللہ تجھے توفیق بخشے تو تم اسے اختیار کر لینا۔عبداللہ اپنے استاد سے رخصت ہوئے اور مختلف ممالک سے ہوتے ہوئے تیونس پہنچے جہاں کے عیسائیوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا کہ آپ ان کے عالم تھے۔آپ نے شاہ تیونس کے ہاں رہائش اختیار کی اور ان کو اپنے ارادے سے بھی آگاہ کیا۔شاہ تیونس بہت خوش ہوا۔جناب عبداللہ نے کہا کہ آپ پہلے میرے ہم مذہبوں سے میرے بارے میں رائے لے لیں پھر میں اسلام قبول کروں گا۔اس پہ شاہ تیونس نے کہا کہ تم نے تو وہی بات کہی جو حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے قبول اسلام سے پہلے کہی تھی۔اس پہ جناب عبداللہ نے کہا یقیناً میری قوم میرے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے ساتھ ان کی قوم نے کیا تھا اور پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ جناب عبداللہ کے اسلام قبول کرنے پر تیونس کے عیسائیوں نے انہیں نہایت ہی برے الفاظ کے ساتھ یاد کیا۔



محترمہ جمیلہ مریم

محترمہ مریم جمیلہ کا تعلق ایک امریکی یہودی گھرانے سے تھا۔بچپن میں میوزک سے بہت لگاؤ تھا۔خاص کر عربی میوزک سے انہیں بے انتہا دلچسپی تھی۔ان کا یہی شوق انہیں اسلام کے قریب لے گیا۔وہ بتاتی ہیں میوزک کے شوق میں ایک دن انھوں نے سورۃ مریم کی تلاوت بھی سنی جس نے انھیں بہت متاثر کیا۔چنانچہ انھوں نے باقاعدہ طور پہ قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔قرآن کا پہلا ترجمہ پڑھتے ہی ان پر یہ حقیقت کھل گئی کہ دین حق تو درحقیقت اسلام ہی ہے ان کے چند تاثرات انھی کی زبانی سنیئے۔

جونہی میں نے اس کتاب کو کھولا ایک زبردست انکشاف نے میرا استقبال کیا۔زبان کا حسن اور بیان کی فصاحت مجھے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔مترجم نے آغاز میں ہی اس بات

کی وضاحت کردی کہ یہ قرآنی مفاہیم کو جیسا کہ عام مسلمان سمجھتے ہیں انگریزی میں زبان میں پیش کرنے کی ایک کوشش ہے اور جو شخص قرآن پہ یقین نہیں رکھتا وہ اس کا حق کبھی بھی ادا نہیں کرسکتا۔قرآن کو پڑھنے کے بعد میرے پاس اس بات کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ میں فوراً اس پہ ایمان لے آؤں پھر میں نے دین اسلام کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا اور اس مشکواۃ کے مطالعے سے مجھے اس حقیقت میں ذرا بھر بھی شبہ نہ رہا کہ قرآن دراصل وحی الٰہی ہے اور اس پہ ایمان لائے بغیر نجات ناممکن ہے۔

دین قبول کرنے کے بعد محترمہ مریم جمیلہ نے امریکہ میں رہنا پسند نہ کیا اور وہ مستقل طور پہ پاکستان منتقل ہو گئیں۔ یہاں آ کر انھوں نے دین اسلام کی خدمت شروع کر دی۔انھوں نے اسلام پہ کئی کتابیں تحریر کیں جن میں" **اسلام اینڈ ماڈرن ازم اور اسلام ان تھیوری اینڈ پریکٹس** "نے بہت مقبولیت حاصل کی۔2012ء میں اسلام آباد میں انتقال فرما گئیں۔



علامہ محمد اسد (پولینڈ)

آپ ۱۹۰۰ء میں پولینڈ کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ عملی زندگی کا آغاز جرمنی کے ایک اخبار کے ساتھ بطور گشتی صحافی شروع کیا۔ یہی منصب ان کو مشرق وسطیٰ لے گیا جہاں انھوں نے اہل عرب کی سادہ مگر پر تکلف زندگی کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کے طرزِ عمل کا بڑے قریب سے مطالعہ کیا اور اس کا تقابل مغرب کی بے چین اور خود غرضی کی مشینی زندگی کے ساتھ کیا تو انھیں اسلامی زندگی میں بہت کشش نظر آئی۔ انھوں نے اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا اور پھر دین اسلام قبول کر لیا۔ قبول اسلام کے بعد وہ برصغیر میں منتقل ہو گئے اور ایک عرصہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کی صحبت میں گزارا جہاں آپ کو مزید علم حاصل کرنے کے مواقع ملے۔ قیام پاکستان پر حکومت پاکستان نے ان کی خوب پزیرائی کی اور جناب محمد اسد کئی کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔ پہلے انہیں ایک محکمہ ”

اسلامی تعمیر جدید' سونپا گیا اس کے بعد ان کی خدمات محکمہ خارجہ کو منتقل کر دی گئیں اور وہ پاکستان کے خاص افسر اعلیٰ کی حیثیت سے مشرق وسطیٰ میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔اس کے بعد ان کا تقرر اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوبِ خاص کے طور پہ کیا گیا۔انھوں نے دین اسلام کی حقانیت پہ سیر حاصل مباحث چھوڑے ہیں۔

ان کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں جن کے نام " **اے روڈ ٹو مکہ اور سلام آن کراس روڈز** ہیں، جناب علامہ اسد صاحب نے اپنی کتاب اے روڈ ٹو مکہ میں اپنے اسلام لانے کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے جہاں سے ایک مختصر انتخاب پیش خدمت ہے۔

"میں اسلام کی تعلیمات میں سے کسی ایک تعلیم کو متعین نہیں کر سکتا جس نے میرے دل کو اپنی طرف مائل کیا ہو۔اسلامی تعلیمات کے مکمل اور حسین مجموعہ نے جو ایک طرف روحانی عظمتوں کا امین ہے تو دوسری طرف عملی زندگی گذارنے کا بہترین پروگرام ہے نے مجھے اپنی طرف مائل کیا۔چنانچہ جب اسلامی تعلیمات کی غیر محدود قوت اور عملی زندگی سے ان کی تطبیق کی صلاحیت مجھ پر منکشف ہوئی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آخر آج کا مسلمان اس حیات بخش اور قوت بخش نظام سے دور کیوں ہے۔میں نے اس سوال کا جواب کئی مسلمانوں سے پوچھا لیکن کوئی مجھے تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔یہ سوال میرے ذہن پہ یوں سوار ہوا کہ میں مسلمانوں سے اس بات پہ جھگڑا شروع کر دیتا کہ وہ اپنے دین سے دور کیوں ہو رہے ہیں گو میں جو خود ابھی ایک غیر مسلم تھا۔مسلمانوں کے سامنے اسلام کے دفاع میں مصروف تھا اور آخر کار قدرت نے میری راہنمائی کی اور میں خود اس قافلہ حق کے ساتھ شامل ہو گیا اور آج میرے نزدیک اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں کہ میں مسلمان ہوں۔اگر چہ میں آج بھی مسلمانوں سے اس بات پہ جھگڑا کرتا ہوں کہ

وہ آفاقیت کے اس رستے سے گریزاں کیوں ہیں جو ان کا عقیدہ ہے، ان کا مذہب ہے ان کا دستورِ عمل ہے مگر اکثر لوگ میری باتوں پہ غور نہیں کرتے اور یہی دکھ میری روح کا آزار ہے۔



ڈاکٹر عبداللہ علاؤ الدین

جرمنی کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق تھا۔والدین کی خواہش تھی کہ وہ پادری بنیں اس لیے انھیں پروٹسٹنٹ طریقے کے مطابق کلیسا میں داخل کرا دیا گیا۔جلد ہی جناب عبداللہ علاؤ الدین اساتذہ کے ناپسندیدہ شاگرد قرار دے دیئے گئے۔اس لیے کہ ان کے چبھتے سوالوں کا جواب ان اساتذہ کے پاس نہ تھا۔ان کا دل تثلیث اور کفارہ کے عقائد کو قبول کرنے سے انکاری تھا۔وہ دین اسلام کے حوالے سے اپنے اساتذہ کے ساتھ الجھے رہتے۔چنانچہ ان پر منکر خدا ہونے کا فتویٰ لگا کر ان کو گرجے سے نکال دیا گیا جس کا ان کے گھر والوں کو بہت دکھ تھا۔چنانچہ انھوں نے اپنا گھر بھی چھوڑ دیا اور حقیقت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔اُن کے شب و روز لائبریریوں میں گذرنے لگے۔

ان شب و روز کا تذکرہ انھوں نے اپنی مشہور سوانح عمری " **ھم مسلمان کیوں ھوئے** " میں ان الفاظ میں کیا ہے۔میری صحت مسلسل مطالعہ سے خراب رہنے لگی تھی کیونکہ بعض اوقات میں صرف دو گھنٹے کے لیے سوتا اور باقی سارا وقت پڑھتا رہتا۔تاہم میں حقیقت کی تلاش میں ناکام رہا۔پھر اللہ

کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے مجھ پہ اپنا کرم کیا جب میں نے اپنی قوت ارادی پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا تب میرے ہاتھ ایک جہاز راں کا سفر نامہ لگا جس میں پہلی دفعہ میں نے سورۃ اخلاص کا مطالعہ کیا۔میں نے دوبارہ اس کو پڑھا یعنی اس کے ترجمے کو پڑھا پھر سہ بار پڑھا میں اس حقیقت کو اپنے سامنے پا کر دنگ رہ گیا جس کی تلاش میں میں برسوں سے بھٹک رہا تھا۔میں نے زندگی میں پہلی بار پڑھا کہ نہ اللہ نے کوکسی نے پیدا کیا اور نہ ہی اللہ کا کوئی بیٹا ہے۔قرآن کی ان آیات کو میں پوری طرح سمجھ گیا۔مجھے اسلام کے متعلق زیادہ علم نہ تھا مگر اب ایک تڑپ تھی جس نے میرے اندر ایک آگ لگا رکھی تھی۔اس دن میں ایک سڑک سے گذر رہا تھا نہ جانے کس کا ایک سائیکل سڑک پہ کھڑا تھا میں نے اسے اٹھایا اور جرمنی سے استنبول کی طرف اپنا سفر اسی سائیکل پہ شروع کر دیا۔استنبول پہنچ کر میں نے قرآن حاصل کیا اور اس کو اس طرح پڑھنا شروع کیا جس طرح اپنی مذہبی کتابوں کی غلطیاں نکالا کرتا تھا۔تاہم جوں جوں میں آگے بڑھتا رہا میرے دل کو ہدایت نصیب ہوتی رہی۔میں قرآن سے کوئی غلطی تو کیا تلاش کرتا قرآن نے مجھ پہ میری غلطیاں منکشف کر دیں یوں اللہ نے مجھ پہ اپنا احسان کیا اور میں دولت اسلام سے مالا مال ہو گیا۔



ڈاکٹرعرینیہ(فرانس)

ڈاکٹرغرینیہ کوزندگی میں دوہی شوق تھے کتابیں پڑھنااور بحری سفرکرنا۔وہ بتاتے ہیں اسی شوق نے مجھے منزل مرادتک پہنچایا۔ایک دن یونہی میں قرآن کی ورق گردانی کررہاتھا کہ سورہ نورکی اس آیت پہ میری نظریں جم گئیں۔

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُوراً فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ O

القرآن الحکیم (سورۃ نور ۲۴/ آیات ۴۰)

ترجمہ:

”یا (اعمال کفار) ایسے اندھیروں کی طرح ہیں جو گہرے سمندر میں ہوتے ہیں اور چھا رہی ہوتی ہے اس پہ موج اس کے اوپر موج اور اس کے اوپر بادل (تہہ در تہہ) اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر جب وہ نکالتا ہے اپنا ہاتھ تو نہیں دیکھ پاتا اسے اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کے لیے اللہ تعالیٰ نور نہ بنائے اس کے لیے کہیں نور نہیں“۔

****

ڈاکٹر غرینیہ کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ آیات پڑھی تو میں نے سوچا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ایسے شخص رہے ہوں گے جنہوں نے میری طرح بہت سے بحری سفر کیے ہوں گے اور جن کے دن رات میری طرح سمندروں میں گزرتے ہوں گے۔ ان آیات نے قرآن کی زبانِ فصاحت اور تمثیل کی عمدگی کا ثبوت فراہم کیا۔ میں ہمیشہ سے ایسی عبارات سے عشق کرتا رہا تھا جن میں الفاظ تھوڑے ہوں مگر ان میں کئی جہانِ معنی بند کر دیئے گئے ہوں۔ چنانچہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ اسلوب کا اعتراف تھا میں نہیں جانتا تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے کہ مجھے تو ہمیشہ یہی بتایا گیا تھا کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے۔ میں نے سورۃ نور کی ان آیات کو چشمِ تصور میں دیکھا کہ گویا ان الفاظ کا کہنے والا خود رات کی تاریکی میں بادلوں کی دبیز سیاہی میں موجوں کے ایک طوفان میں کسی جہاز پہ کھڑا ہے اور ایک ڈوبتے شخص کی بدحواسی کو دیکھ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سمندری خطرات کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر بھی اس قدر گنتی کے لفظوں میں ایسی جامعیت کے ساتھ خطراتِ بحر کی صحیح کیفیت بیان نہیں کر سکتا کچھ عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی کوئی بحری سفر کیا ہی نہیں اور نہ ہی انھوں نے کوئی کتاب لکھی ہے۔ تب میرے دل پہ چھائے اندھیرے کے بادل چھٹ گئے اور میں نے اسلام کے وسیع دامن میں پناہ لی۔



ڈاکٹر خالد شیڈرک

ڈاکٹر خالد انگلستان کے معروف صحافی تھے۔ مذہبی ماحول میں پرورش پائی۔ مطالعہ کا بے پناہ شوق تھا اور یہی شوق ان کو اسلام کے قریب لے آیا۔ بیان کرتے ہیں کہ میرا اسلام قبول کرنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا اور نہ ہی میں نے کبھی ایسے سوچا تھا مگر جب میں مستشرقین کی کتابیں پڑھتا تو میں دیکھتا کہ مستشرقین اسلام کے بارے میں امتیازی سلوک روا رکھتے ہیں۔ زندگی یونہی گزر رہی تھی مذاہب عالم پہ مجھے جو ملا میں پڑھتا چلا گیا۔ میں نے پورے انگلستان کی لائبریریاں کھنگال ڈالیں میں نے ایک بات خاص طور پہ نوٹ کی کہ جب بھی میں کسی مستشرق کی کتاب پڑھتا تو وہ یہودیت بدھ مت اور ہندومت جیسے مذاہب کی تفصیلات بیان کرتا اور خاموشی گذر سے جاتا مگر جونہی وہ اسلام کی بات کرتا اس کی زبان یا قلم انگارے اگلنے لگتی اور کوئی بھی مصنف طعن و تشنیع کے بغیر اسلام پہ اپنی بات مکمل نہ کرتا۔ مجھے یہ اسلوب کچھ اجنبی اور عدل سے عاری لگا۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ مستشرق

اسلام کو الگ سے کوئی دین تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہوتا بلکہ ان کے خیال میں اسلام عیسائی لٹریچر سے ماخوذ چند اقوال اور رسم و رواج کا مجموعہ ہے۔ یہ بات بھی میرے حلق سے نہ اترتی کہ وہ چند ہزار پارسیوں کے الگ مذہبی تشخص کو تو تسلیم کرتا ہے مگر ایک ارب ساٹھ کروڑ سے زائد لوگوں کے مذہب کو چند ماخوذ رسم رواج کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ اگر مسلمان عیسائیوں ہی کی ایک شاخ ہیں تو پھر ان پر اس قدر اعتراضات کیوں طعن و تشنیع اور شور و واویلا کیوں۔ اس کا کیا جواز ہے۔ چنانچہ حقیقت کی یہی تلاش مجھے اسلام کی روشن تعلیمات کی طرف لے گئی اور مجھے اسلام سے آشنا ہونے کا موقع مل گیا۔ میں نے طے کر لیا کہ اب میں اسلام پر صرف مسلمانوں کی کتابیں پڑھوں گا۔ چنانچہ میں جوں جوں تحقیق کے اس میدان میں آگے بڑھا شرمندگی سے میرا دامن بھیگنے لگا کہ میں ایک ایسے مذہب کا پیرو ہوں جس میں عدل نام کو بھی نہیں۔ میرے آباء خود بھی گمراہ رہے اور انھوں نے میری گمراہی میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ قرآن کے مقابلے میں جب میں نے عیسائی لٹریچر کو رکھا تو میرے اندر اس بڑی تبدیلی نے جنم لیا جس کے اختتام پر اللہ نے مجھے اپنی ہدایت سے نواز، الحمدو للہ



پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ

انگریز مورخ آرنلڈ کا کہنا ہے کہ اسلام پہ یہ الزام کہ وہ تلوار کے زور پہ پھیلا سراسر بہتان ہے۔ کیونکہ اسلام اپنی حقانیت تعلیمات اور اثر ورسوخ کی بنیاد پر پھیلا پروفیسر آرنلڈ کہتا ہے کہ میں اس امر پہ ششدر ہوں کہ اسلام نے اپنے سیاسی زوال اور انحطاط کے زمانے میں بھی نہ صرف اپنے وجود اور نظریے کو قائم رکھا بلکہ بعض نہایت شاندار روحانی فتوحات بھی حاصل کیں۔ مثلاً اسلام کی تاریخ میں دو مواقع ایسے آئے جب وحشی کفار نے مسلمانوں کو سختی سے پامال کیا۔ سلجوقی ترکوں نے گیارہویں صدی میں اور تاتاریوں نے تیرہویں صدی میں مگر ان دونوں موقعوں پر فاتحین اقوام نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ ابھرا۔ پھر مسلمان مبلغین نے اپنا مذہب وسطی افریقہ چین اور جزائر ہند چینی میں پھیلایا حالانکہ ان کو وہاں کسی دنیاوی حکومت کی

حمایت بھی حاصل نہ تھی۔ یہی وہ چند بنیادی نقات تھے جنھوں نے مجھے اسلام کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی طرف مائل کیا۔ اس کے بعد میں نے اسلام کی حقیقی اساس کی تلاش میں جہد وسعی کی اور اللہ نے منزل کی طرف میری رہنمائی کی۔



لارڈ ہیڈلے فاروق

لارڈ ہیڈلے انگلستان کے لارڈ تھے۔ وہ سیاست دان بھی تھے اور مصنف بھی۔ 1918ء میں انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور شیخ رحمت الفاروق کے نام سے شہرت حاصل کی۔ انھوں نے اسلام سے متعلق بہت سی کتابیں لکھیں ان کی ایک مشہور کتاب (Western Awakening to Islam) ہے جس میں وہ اپنے اسلام لانے کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"ممکن ہے میرے کچھ دوست یہ سمجھیں کہ میں نے مسلمانوں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرلیا۔ میرے اسلام قبول کرنے کا سبب یہ نہیں۔ میرا اسلام تو کئی سالوں کے مسلسل مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ میں نے جب مسلمانوں سے اسلام کے موضوع پر گفتگو شروع کی تو مجھے اس بات سے خوشی اور قلبی سکون محسوس ہوتا ہے کہ میرے خیالات اور افکار اسلام کی

تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں۔قرآن کی تعلیمات کے مطابق انسان دین اسلام اسی صورت قبول کرسکتا ہے جب اس کا دل اس کی صداقت پہ مطمئن ہو جائے۔جبر و اکراہ سے کسی کو اس دین کے حلقے میں داخل نہیں کیا جاسکتا ۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا بھی یہی مفہوم ہے۔دین اسلام کی تعلیمات مروجہ عیسائیت کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے زیادہ قریب ہیں۔کیونکہ حلم اور وسیع النظری اسلام ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔حقیقت یہ ہے کہ میں اسلام قبول کرنے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے دور نہیں ہوا بلکہ صحیح عیسائیت کے قریب آیا ہوں اور اپنے آپ کو پہلے سے بہتر عیسائی محسوس کرتا ہوں میں توقع کرتا ہوں کہ میرے سابق ہم مذہب میری اس مثال کی تقلید کریں گے اور یہی میرے خیال میں بہتر رویہ ہے۔



الفانسواتیین

آپ کا تعلق فرانس سے ہے اور آپ تحریک مستشرقین سے وابستہ تھے۔ وہ بہت بڑے اور ماہر آرٹسٹ تھے۔ وہ نہایت شریف النفس انسان تھے۔ مدتوں مظاہر فطرت میں رب کائنات کی شانِ خلاقیت کا مطالعہ کرتے ہے۔ آخر کار اللہ نے ان کی راہنمائی کی اور وہ دین اسلام کی پناہ میں آ گئے۔ قبول اسلام کے بعد انھوں نے اپنا نیا نام ناصر الدین رکھا اور اپنی ساری زندگی اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے دین اسلام کی خدمت میں گذار دی۔ انھوں نے مستشرقین کی طرف سے اسلام پر لگائے گئے اعتراضات کے کافی وشافی جواب دیئے اور ثابت کیا کہ اہل مغرب علم، ثقافت، شجاعت یا کسی بھی اور میدان میں مسلمان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے اُن کی بے پناہ خدمات کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں عیسائیت اپنی اصل ہیت کو گم کر چکی ہے اور ایک جمود کا شکار ہے جبکہ اسلام نہ صرف یہ کہ ایک زندہ مذہب ہے بلکہ متحرک

مذہب ہے جو انسانی زندگی کے تمام تر معاملات کو محیط ہے اور دامن اسلام میں انسان کسی قسم کی تشنگی محسوس نہیں کی بلکہ یک گونہ آسودگی کا ایک احساس اُس کے ہمنوا ہو جاتا ہے۔



یہاں کچھ تذکرہ اُن سیاہ بخت مستشرقین کا ہے جن کی ساری زندگیاں اسلام اور پیغمبر اسلام پر کیچڑ اچھالتے گزر گئیں۔ مستشرقین کا یہ گروہ اس دنیا میں ہمیشہ اسلام کے خلاف تعصب کی آگ میں جلتا رہا اور آخرت میں یہ دوزخ کی آگ میں جلنے والے ہیں۔

زہر قلم

تحریک استشراق ایک تسلسل ہے اُس زہر کا جو اہل مغرب کے قلم اگلتے ہی رہے،نفرت کے شرارے،حسد و بغض کے انبار،الزامات واتہامات،کذب وافترا،دہکتے انگارے ہی اُس قلم کا کل اثاثہ تھے جو حسد و بغض میں جلے سینوں کا ظاہری عکس تھے۔جن ہاتھوں میں وہ قلم تھے وہ علم کے نام پر جہالت بانٹ رہے تھے،وہ اس قدر بے عدل تھے کہ اپنی اس صفت میں وہ یکتا تھے۔وہ چند ایک نہیں بلکہ بے شمار تھے اور یہ آج کل کی بات نہیں بلکہ صدیوں کا ایک تسلسل ہے جس میں دھواں دیتے اِن سینوں کا غبار کسی نہ کسی سطح پر ضرور محسوس کیا جاتا رہا ہے۔دل تو نہیں چاہتا کہ اس تذکرے کو مزید طویل کیا جائے مگر دشمن کو پہچاننا اور دشمن کی چالوں کو سمجھ کر عقل سے اُن کا رد کرنا بھی تو اسلام کے احکامات میں شامل ہے۔اس لیے ذیل میں ہم اس بدقسمت قبیلے کے کچھ لوگوں کے نام اور اُن کی کتابوں کا کچھ تذکرہ کریں گے۔یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے خاص طور پر اسلام اور پیغمبر اسلام کو اپنا

ہدف بنائے رکھا۔یقیناً اِن لوگوں کے لیے اس دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی عذاب ہے۔

- آدم(Adams Isase)۔

Mohammad and Mohammadanism.

Chicoago 1900ء

****

- ایڈیسن (Addison lancelat)

The Life and deth of Mohammad.

The author of the Turkish Religion.

London 1679ء

****

- ایڈلر(Addler Fellx.M.)

Moyammed.

Philladelphia 1901ء

****

(Ahren Karl)اہرن

Mohammadals Religions stifter.

Leipzig. 1935ء

****

(Aitonn, Johan) ایٹن

The land of Messiah.

Mohomet and the pope.

London 1854ء

****

(Aronld. T.W.) آرنلڈ

The Preaching of Islam.

London 1896ء

****

(Arnold,J.M.)آرنلڈ

Islam its History,character and Relation to Christianity.

London۱874ء

****

☚ ارونگ (Irving Washington)

Life of Mahoment.

New York ۱811ء

****

☚ اوکلے (Ockley Simon)

History of The Saraceus

London ۱847ء

****

☚ اوکسی گان(OKsegon L.L.e)

Confutaction del Alovany Secta Mohammetana.

Gronad ۱555ء

****

☚ ایج مین (Eigeman, Jakob)

Mohammad de Profet der Arabieren.

Amesterdam 1898ء

****

☚ اوسنر (Oeisner,C.E.)

Des effectts de tareligion de Mohammed.

****

☚ اوسبن (Osbon,R.D.)

Islam under the Arabs.

London 1876ء

****

☚ اوزرن (Osztern,S.)

Vizalt Mohammed Kuranjanak ethik.

Budapest. 1902ء

****

- اسٹیب (Stubbe,h)

An account of the and progerss of Islam.

London. 1911ء

****

- اپام (Upham ,Edward)

History of the ottomon Empire.

Preceded by the life of Mohammad.

Hurst. 1835ء & 1826ء

****

- اشپرینگر (Sprenger,A.)

Life of the Mohammad.(1851)

Das lebas and die leh redes Mohammad.

1861ء

****

- اسمتھ (Smith, Bosworth)

Muhamad and Mohammadenism.

London 1872ء

Lahore 1878ء

****

☚ بخیلات (Bachelat Theodore)

Mahmomet at les Arabs.

Rome.1878ء

****

☚ بیڈول (Badwell.W.)

Mohmmedis impose turae.

London. 1615ء

****

☚ برن فیلڈ (Bernfeid Simon)

Mohammad, His Biography.

Warsa. 1914ء

****

☚ بیسان (Besant Annie)

The Life and teching of Mohammad.

Adyar 1932ء

****

☚ بلادخیر (Blachore Regis)

Le Problems de Mahomet.

Paris 1952ء

****

☚ بلام (Blom, P.)

Mohammad of Koramen.

Hamar 1904ء

****

☚ بلائٹ (Blytt. Eva.)

Muhammad Islam Store profet.

Kristiannica. 1911ء

****

☛ (Bowen , George) بووین

Life of Muhammad.

Bomby. 1851ء

☛ (Brandes C.E.C) برانڈے

Muhammad Skuespiel, the akter

Ohenhaven. 1895ء

****

☛ (Bodely, R.V.C.) بوڈلے

The Massenger Muhammad.

London. 1946ء

****

☛ (Boulain Viaaiers H.C.) بولین ولیرز

Amersterdam. 1731ء

****

☚ ری گنی (Brequigny. H.D.)

Veber Muhammad.

Frakfurt. 1791ء

****

☚ بریم (Briem O.E.)

Budha,Muhammad,Jesus.

London. 1938ء

****

☚ بروکلمان (Brockeimanna.c)

History of the Islamic People.

New york. 1947ء

****

☚ براؤن (Brown,D.A.)

The era of Mahomet.

Londen. 1856ء

****

☚ بوہل (Buhl,F.P.W.)

Des leban Muhammeds.

Leipzig 1930ء

****

☚ پونی (Ponet, Rudi)

Mohammed under Koran.

Stuttgart. 1951ء

****

☚ پائنی(Payne,P.S.R)

The Holy Sworel the Story of Islam from Muhan to the present.

London. 1961ء

****

پیڈیو (Pedio,San Paswal)

Contra Lospartalista Mahometanos.

Rome. 1905ء

****

پروخش (Prucksch,otto)

Uber die Bluctrache beiden

Leipzig 1899ء

****

(Taylor W.C.)

History of Mohametanism and its Sects.

London. 1834ء

****

ٹنسڈال (Tinsdall, W ST.C.)

Sances of the Quien.

London. 1905ء

****

- ٹائن بی (Toynbee A.j.)

A Study of History.

London. 1954ء

****

- ٹرپن (Turpin F,R.)

Historie de la Via de Mahomet.

Paris 1776ء

****

- جبریلی (Gabriele)

Muhammed and the conquestts of Islam.

New York. 1968ء

****

جگنیئر (Gagnier, J)

Vie de Mohammed.

Amesterdam. 1748ء

****

جینوے (Genevay.A.)

Mohammed.

Paris 1838ء

****

جیورگن (Georgens,E.P.)

Mohammadein Characrbild.

Berlin 1878ء

****

جیفرے (Jaffery , Arthur)

Islam Mohammed and His religion.

New York. 1958ء

****

- جانسٹن (Johnston ,p.Lacy)

Mohammad and his power.

New york. 1901ء

****

- چیورغیو (Cheorghur C.V.)

La Via de Mahomet.

Paris 1962ء

****

- چگاوٹ (ChagaVat ,Michel.S.)

Mahomet les khalifes.

Paris 1912ء

****

- درمنگھم (Darmenghem,E.)

La Via de Mahomet.

Paris 1929ء

****

- (Ducati ,Bruno) دوکات

Maometton.

Flornace 1929ء

****

- (Dale codetrey) ڈالے

Maishaya Muhammad.

London 1901ء

****

- (Dibble, R.F.) ڈبلے

Mohammad.

New york.1926ء

****

- (Davenport, John) ڈیون پورٹ

Apology for Mohammad and the Quran.

Lahore. 1975ء

****

☚ ڈوریرو (Duryer, Andre.)

The Alcoran of Mahomet

London. 1949ء

****

☚ ڈریکارٹ (Draycott G.M.)

Mahomet Founder of Islam.

London 1915ء

****

☚ ڈوکاسے (Ducasse Raymond.)

Mahomet dauson lemps.

Geneva 1908ء

****

☚ ڈیورجرس (Desvergers.N)

La Via de Mahomet.

Paris 1937ء

****

(Raleigh, Sir .W.) ریلے

The life and deth of Muhammad.

London 1937ء

****

(Ram polde) رام پوڈی

Vita di Maometto.

Milano 1922ء

****

(Reckander,H) ریکنیڈر

Mohammad und die seninen.

Leipzig 1907ء

****

(Rehm.H.S) ریم

Mohammad und die welt des Islam.

Leipzig. 1755ء

****

☚ (Reinaud, J.J.) رینو

Notics sur Mahomet.

Paris 1860ء

****

☚ (Reland, H.) ریلان

De religione Mohammedica libra due.

Utruth. 1707ء

****

☚ (Ranan, Ernest) رینان

Mahomet et ler origiones de L Islam.

Paris. 1880ء

****

☚ (Rink,F.Th.) رنک

L.Islam et son Prophet.

Lausanna 1870ء

****

- ریولین (Rivlin. Josef,J.)

Hayyey Muhammad.

Mizz. 1932ء

****

- روبک (Robuck)

Life of Mohamet.

London 1833ء

****

- رومر (Romro , Jacob)

Mohammad.

New York 1907ء

****

☚ زکریا (Zakarias Henna)

Voice le Vraj Mohammed et la Faux Coran.

Paris 1960ء

****

☚ سیکو (Sacco, G.)

le Gandenze religion de Mohammed.

Rome. 1912ء

****

☚ سیل (Sale, George)

The Koran or Al Coran of Mohammad.

London 1734ء

****

☚ سونڈرز (Saunders,J.J.)

A History of Medieval Islam.

London. 1965ء

****

☚ طوراینڈے (Tor Andree.)

Mohammad,The man and His faith.

London. 1956ء

****

☚ فیورٹ (Favort ,Alexis)

Mahomet La Science Chezes Arabs.

Paris 1866ء

****

☚ فارسٹر (Forster Charies)

Mahometanism unveiled.

London 1829ء

****

☚ فوربنگ (Forebing, J.C.)

Annali dell , Islam.

1905ء Hepoli. (*4)

